

ماہنامہ
محمد الیکس گھمن

فقیہ
سرگودھا
ماہنامہ

شمارہ 10

اکتوبر 2015

جلد نمبر 4



● تقلید ائمہ کی اہمیت و ضرورت

در نبی پر...

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ

www.ahnafmedia.com



مرکز اہل السنۃ والجماعت سرگودھا کا ترجمان

فقیہ
سرگودھا
ماہنامہ

جلد نمبر 4 اکتوبر 2015 شمارہ نمبر 10

معاون مدیر
مولانا محمد کلیم اللہ حنفی

مدیر
مولانا محمد الیاس گھمن

خط و کتابت کا پتہ

دفتر رسائل و جرائد
مرکز اہل السنۃ والجماعت
87 جنوبی سرگودھا

mag@ahnafmedia.com

بیرون ممالک
امریکہ، اسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک
35 ڈالر..... سالانہ
سعودیہ، انڈیا، متحدہ عرب امارات اور عرب ممالک
25 ڈالر..... سالانہ
ایران، بنگلہ دیش 20 ڈالر..... سالانہ

آن لائن پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے

www.ahnafmedia.com

قیمت فی شمارہ 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

سالانہ 300 روپے
زرتعاون

سرکولیشن مینیجر
0332-6311808

صبح 8 تا 4 بجے شام

WhatsApp
+923062251253

مرکز اہل السنۃ والجماعت سرگودھا

فہرست

4 درِ نبی پر

اداریہ

6 سانحہ حرم شریف

عابد محمود عزام

11 محرم الحرام کا مہینہ

مفتی محمد راشد ڈسکوی

24 تقلید ائمہ کی اہمیت و ضرورت

عبد العظیم اسماعیل ندوی

37 حقانیتِ کلام اللہ

مولانا شفیق الرحمن گلگتی

41 اسلام پر آمن مذہب ہے !!

مولانا محمد اختر حنفی

43 امام سلیمان بن مہران الاعمش (3)

مفتی شبیر احمد حنفی

51 عربی خطیہ جمعہ مقامی زبان میں

الشیخ محمد نواز الحدادی

شاید حضور ہم سے خفا ہیں !!!

..... مظفر وارثی

جا زندگی مدینے سے جھونکے ہوا کے لا
شاید حضور ہم سے خفا ہیں منا کے لا

ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے امت رسول کی
ابوبکر سے کچھ آئینے صدق و صفا کے لا

دنیا بہت ہی تنگ مسلمان پہ ہو گئی
فاروق کے زمانے کے نقشے اٹھا کے لا

گمراہ کر دیا ہے نظر کے فریب نے
عثمان سے زاویے ذرا شرم و حیا کے لا

یورپ میں مارا مارا نہ پھرے گدائے علم
دروازہ علی سے یہ خیرات جا کے لا

باطل سے دب رہی ہے امت رسول کی
منظر ذرا حسین سے کچھ کر بلا کے لا

درِ نبی پر

کھ..... ادارہ

آئیے! اس کے در اقدس کی چوکھٹ کے اپنی نگاہوں سے بوسے لیتے ہیں جس کی پُر تاثیر نگاہ نے انسانیت کے بگڑے مزاج کو بدلا، برے حالات سے نجات دی، خونیں واقعات کو لگام دی، گندے خیالات کے زاویے موڑ دیے، مردہ قوموں نے جس کی پاکیزہ حیات کے طفیل حیاتِ جاودانی کے گوہر سمیٹے۔ گنبدِ خضریٰ کی آغوش نے اپنے اندر ایسے لعل کو سلایا ہوا ہے جس نے انسانیت کو میٹھی نیند سلایا۔ انوارِ الہی کی تجلیات کو جذب کر کے قلبِ اطہر سے نورِ ہدایت کی کرنیں بکھیریں۔ جس کی بدولت انسانیت کی تمام اصناف نے کمالِ لازوال حاصل کیا۔

اس کہسار سے پوری وادی میں علم و عمل، تہذیب و تمدن، عزت و شرافت، عظمت و وقار، غیرت و حمیت، سطوت و ہیبت، جاہ و حشمت، بصیرت و حکمت، عزیمت و فراست، شان و شوکت، صداقت و عدالت، سخاوت و شجاعت، خلافت و حکومت، سیاست و حاکمیت کے صافی چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اور گلستان میں امن و آشتی، آزادی و حریت، سکون و راحت اور قلبی طمانیت کے برگِ گل سے مشامِ جان کو معطر کیے ہوئے ہے۔

کائنات کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل، رنگ، قوم، قبیلہ، برادری، زبان، علاقے اور ذاتِ پات کے تفاوت کی بنیاد پر باہمی برتری و کمتری کی کسوٹی کو یکسر مسترد کر کے معرفتِ خالق اور پرہیز گاری کی اکائی پر یکساں متحد کر دیا۔ ایسا عظیم الشان دستور العمل پیش فرمایا جو صبحِ قیامت تک امنِ عالم کا بلا شرکتِ غیرے

اکیلاضامن ہے۔

کل بھی، آج بھی اور آئندہ بھی اسی دستور کو اپنانے میں فلاح و کامیابی کی ضمانت ہے۔ یہ جزوقتی، ہنگامی اور مخصوص اوقات کے لیے تشکیل نہیں دیا گیا تھا کہ محض وقت گزرنے سے اپنی افادیت کھو بیٹھے۔ جیسا کہ چند مفکرین..... فرائیڈ وغیرہ..... کی فکر و نظر کی کج روی اور شعور و دانش کی کمزوری نے اپنے ایسے فرسودہ خیالات کو عقل نارسا کی پاتال میں پناہ دے رکھی ہے۔

گوشت پوست کے اس مشتمل خاکی کو خواہشات، شہوات، کبر و غرور، تفاخر پسندی، نسل، زبان، علاقے، سیاسی و سماجی اقدار، معاشی و معاشرتی اقدار کی زنجیروں نے ہر طرف سے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ انسانیت اس کے پنجہ استبداد میں سسکیاں لے رہی تھی۔ اگر رحمت کو نین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست کرم سے اس کو آزاد نہ کراتے تو کبھی بھی اس کی فضیلت و برتری ظاہر نہ ہوتی۔

انسانیت کی ستم ظریفی دیکھیے آج اپنے اسی محسن کو فراموش کر بیٹھی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہے جو آج کھلی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ سانحات و حوادث کا بے رحم شکنجہ اس کو دبوچے ہوئے ہے۔ جنگِ عظیم اول اور دوم کی ہولناک بھٹی میں یہی ابن آدم اور بنت حوا خاکستر ہوئے۔ اس کے لبوں پر امن و عافیت کی تمنا دعا کا روپ دھارنے کو ترس گئی ہے۔ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین سے بغاوت کا اثر یہ ہے کہ زمینی و سماوی عذابوں نے ایسے چُر کے لگائے ہیں کہ انسانیت ابھی تک کرب و الم سے کرا رہی ہے، اور یہ اس وقت تک کراہتی ہی رہے گی تا وقتیکہ اس کو اسی در پر نہ لے جایا جائے، جہاں کے ذرے مہر و ماہ کو شرماتے اور دل و نگاہ کو چمکاتے ہیں۔ یعنی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر۔

ساختہ حرم شریف

بھ..... عابد محمود عزام رحمۃ اللہ علیہ

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ عاقل، بالغ اور صاحب استطاعت مسلمانوں پر زندگی میں ایک مرتبہ حج بیت اللہ فرض ہے۔ حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ہر سال دنیا بھر سے مسلمان جوق در جوق بیت اللہ کا رخ کرتے ہیں۔ پہلے سفر کی سہولیات میسر نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اونٹ، گھوڑوں اور پیدل سفر کر کے حج کے لیے آیا کرتے تھے، لیکن اب ہوائی سفر کی وجہ سے حاجیوں کا مکہ تک کا سفر بہت آسان ہو گیا ہے اور پوری دنیا سے لوگ فریضہ حج ادا کرنے آتے ہیں۔ نتیجتاً حاجیوں کی تعداد مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

1950ء سے قبل ہر سال دوران حج ایک لاکھ افراد حج کے لیے آتے تھے، لیکن آج یہ تعداد تیس لاکھ تک پہنچ چکی۔ ماہرین کے مطابق 2030ء تک ہر سال پچاس لاکھ افراد حج کرنے آیا کریں گے۔ اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد سوا دو ارب ہوگی، جبکہ اب ان کی آبادی ایک ارب ساٹھ کروڑ ہے۔ حج دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہے۔ حج سیکورٹی، حفاظت، صحت و علاج، نقل و حمل، رہائش اور کھانے پینے کی چیزوں کی فراہمی کے حوالے سے سعودی حکام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بھی ہے۔

ہر سال عازمین حج کی اتنی بڑی تعداد کے لیے خوراک، رہائش، نکاسی آب اور ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے سعودی حکومت کو تیار رہنا پڑتا ہے اور سعودی حکومت عازمین کے لیے غیر معمولی انتظامات کرتی ہے۔ سعودی حکومت کے متعدد محکمے اور وزارتیں ان انتظامات کو مانیٹر کرتی ہیں، مگر اچانک حادثہ ہو جائے تو عقل انسانی



اور اس کے تمام انتظامات پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ بد قسمتی سے حادثات سے یکسر بچاؤ ممکن نہیں اور حج کے دوران حادثات رونما ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں مکہ مکرمہ میں طوفانی بارشوں کی وجہ سے حرم شریف کی حدود میں کرین گرنے کا سنگین سانحہ پیش آیا، جس میں 107 افراد شہید اور دو سو سے زائد زخمی ہوئے ہیں۔ پاکستانی سفیر کے مطابق ان میں 6 پاکستانی بھی تھے، جبکہ عرب میڈیا کے مطابق مسجد الحرام میں طوفان اور بارش کے دوران تعمیراتی کام میں مصروف کرین گرنے سے 15 پاکستانی شہید ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق 52 پاکستانی زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ 23 مصری، 10 بھارتی، 25 ایرانی، 6 ملائشین، 25 بنگلادیشی ایک الجزائر اور ایک افغانی عازم حج بھی شہدائیں شامل ہیں۔

میڈیا کے مطابق حادثہ کے وقت موسم بہت خراب تھا اور ہوا کی رفتار 83 کلو میٹر فی گھنٹہ تھی، جس کی وجہ سے درخت اور کھجے اکھڑ گئے، آسمانی بجلی گری اور توسیعی کام میں زیر استعمال مشرق وسطیٰ میں استعمال ہونے والی سب سے بڑی کرین عدم توازن کے باعث مسجد کی چھت پھاڑتے ہوئے نیچے جا گری، جس کی وجہ سے بھاری نقصان ہوا۔ جس وقت حادثہ رونما ہوا اس وقت نماز جمعہ کے باعث مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔

حرم شریف میں پیش آنے والے سانحے پر افسوس اور رنج و غم کا جتنا بھی اظہار کیا جائے کم ہے، جو اہل ایمان سانحہ میں شہید ہوئے ان کی ارواح پاک کو جنت کے باغوں میں جگہ ملے گی، انشاء اللہ۔ یہ وہ عازمین حج تھے جو سنت ابراہیمی کی ادائیگی کے لیے دنیا بھر کے مختلف ملکوں سے عازم سفر ہوئے، اپنے بے پایاں مذہبی جذبات، تزکیہ نفس، روضہ رسول کی زیارت، مقامات مقدسہ کے دیدار سے حاصل ہونے والی



روحانی مسرت، حج کے عظیم الشان ارکان کی تکمیل اور تاریخ انسانی کے منفرد و لازوال اجتماع اسلامی سے وابستگی کے لیے حرم شریف میں موجود تھے۔

واضح رہے کہ گزشتہ چند دہائیوں میں سعودی حکومت کی طرف سے خانہ کعبہ کے توسیعی منصوبوں کے نتیجہ میں حجاج کرام کو جو سہولتیں مہیا کی گئیں، ان کو عالم اسلام میں سراہا گیا اور ماضی میں ہونے والے مختلف النوع حادثات کی شرح بھی کم ہوئی، اس وقت 22 لاکھ حجاج کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے 4 لاکھ مربع میٹر توسیعی منصوبہ پر کام جاری تھا۔ توسیع کے کام کی وجہ سے سعودی عرب نے عازمین حج کی تعداد بھی محدود کی ہے۔

2011ء میں تیس لاکھ افراد نے سنت ابراہیمی ادا کی تھی، جبکہ اس کے بعد بیرونی حجاج کی 20 فیصد اور مقامی حجاج کی تعداد میں 50 فیصد کمی کی گئی تھی، جس کا مقصد توسیعی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ تعمیراتی کام مکمل ہونے کے بعد مسجد کے علاقے میں چار لاکھ مربع میٹر اضافہ ہو جائے گا۔ 2011ء سے مسجد الحرام کا توسیعی منصوبہ شروع ہوا۔ اس کے ذریعے مطاف (خانہ کعبہ کے صحن) کا رقبہ ساڑھے تین لاکھ سے بڑھ کر ساڑھے سات لاکھ مربع میٹر ہو جائے گا۔ پورا منصوبہ 2020ء میں ختم ہو گا۔

دراصل دنیا بھر سے مسلمان چند گھنٹے قیام کرنے کی خاطر مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ نہیں آتے، وہ کئی دن بلکہ ہفتوں قیام کرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں رہائش، غذا، صفائی اور ٹرانسپورٹ کی سہولیات درکار ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سہولیات مہیا کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ اور مدینہ میں ہوٹلوں، مہمان خانوں اور ریسٹورانوں کا جال بچھ چکا ہے۔ 12 جنوری 2006ء کو جب رمی جمار میں بھگدڑ مچنے سے ”346“ مسلمان شہید

ہوئے تو سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ نے اپنے مشیروں کو طلب کیا۔
اس اجلاس میں ہی مسجد الحرام کی توسیع کا فیصلہ ہوا اور یہ بھی کہ مکہ مکرمہ،
مدینہ منورہ میں بس و ریل سے آمد و رفت کا نیا نظام ڈیزائن کیا جائے۔ اب سعودی
حکومت ایسی ممتاز کمپنیوں کو تلاش کرنے لگی جو نئے منصوبے پر عملدرآمد کر سکیں۔
اس منصوبے پر اندازاً ”230“ ارب ڈالر“ (دو سو تیس کھرب روپے) خرچ ہونے
ہیں۔

واضح رہے کہ گزشتہ دنوں مکہ مکرمہ میں رونما ہونے والا حادثہ پہلا حادثہ
نہیں، بلکہ ماضی میں بھی کئی ہولناک حادثات رونما ہوتے رہے ہیں۔
دسمبر 1975ء میں گیس کا سلنڈر پھٹنے سے خیمہ بستی میں آگ لگ گئی تھی
اور 200 حاجی شہید ہوئے۔

31 جولائی 1987ء میں ایرانی مظاہرین اور سعودی فوج کے مابین ہونے
والی جھڑپ سے 400 سے زیادہ حجاج جاں بحق، جبکہ کئی ہزار زخمی ہوئے۔
9 جولائی 1989 کو دو بم پھٹے جن سے ایک حاجی جاں بحق اور 16 زخمی
ہوئے۔

2 جولائی 1990 کو مکہ سے منی اور میدانِ عرفات کی طرف جانے والی
ایک سرنگ میں بھگدڑ مچی اور 1426 افراد جاں بحق ہوئے، زیادہ تر کا تعلق ملائیشیا،
انڈونیشیا اور پاکستان سے تھا۔

23 مئی 1994 کو رومی کے دوران مچنے والی بھگدڑ سے کم از کم 270 حاجی
جاں بحق ہوئے۔

5 اپریل 1997 کو منی میں 8 ذوالحجہ کو لگنے والی آگ سے 343 حجاج شہید



اور 1500 زخمی ہوئے۔ یہ آگ صبح دس سے رات بارہ بجے تک لگی رہی۔ تب سے خیمے آگ سے محفوظ بنائے جاتے ہیں۔

9 اپریل 1998 کو جمرات کے پل پر ہونے والے ایک حادثے میں 118 افراد شہید اور 180 زخمی ہوئے۔

5 مارچ 2001 کو رمی کے دوران 35 حاجی کچلے جانے سے جاں بحق ہوئے۔

11 فروری 2003 کو رمی کے دوران 14 افراد جاں بحق ہوئے۔

یکم فروری 2004 کو منیٰ میں رمی کے دوران بھگدڑ سے 251 جاں بحق اور 244 زخمی ہوئے۔

5 جنوری 2006 کو مسجد الحرام کے پاس ایک کثیر منزلہ ہوٹل کی پختہ عمارت گر گئی۔ ہوٹل میں حجاج کو ٹھہرایا جانا تھا۔ اس حادثے میں کل 76 افراد جاں بحق اور 64 زخمی ہوئے۔

12 جنوری 2006 کو حج کے آخری دن رمی الجمرات کے دوران کم از کم 346 افراد کچل کر شہید اور 289 زخمی ہوئے۔ یہ حادثہ دن کے 1 بجے کے بعد پیش آیا، جب عازمین حج سے بھری ایک بس کے عازمین حج پل جمرات کے مشرقی راستے پر پہنچے تو کچھ افراد گر گئے اور یہ حادثہ شدت اختیار کر گیا۔ اس وقت لگ بھگ 20 لاکھ افراد مناسک حج ادا کر رہے تھے۔ اس حادثے کے بعد جمرات کا پل اور شیطان والے ستون ہٹا کر دوبارہ بنائے گئے ہیں۔ ایک زیادہ وسیع اور کئی منزلہ پل بنایا گیا ہے اور شیطان کے ستون بھی نئے اور بڑے بنائے گئے ہیں۔ اب ہر منزل پر آنے اور جانے کے راستے محفوظ تر ہیں۔

محرم الحرام کا مہینہ

(شرعی حیثیت، احکامات، سوگ کا حکم، شادی کا حکم)

بھ..... مفتی محمد راشد ڈسکوی رحمۃ اللہ علیہ

نئے ہجری سال کی ابتداء:

”زمانہ“ مدینہ منورہ کے طرف ہجرتِ نبوی ﷺ سے لے کر اب تک ایک صدی اور چار سو پینتیس سال کا سفر طے کر چکا ہے، چودہ سو چھتیسواں سال شروع ہو چکا ہے، محرم الحرام اسلامی تقویم ہجری کا پہلا مہینہ ہے، کتنے ہی پڑھے لکھے، دیندار لوگ ایسے ہیں، جنہیں اسلامی تقویم کا علم ہی نہیں، ان سے اسلامی مہینوں کے نام معلوم کر لیں وہ آپ کو نہیں سنا سکیں گے، ان سے روزانہ کی اسلامی تاریخ معلوم کی جائے تو وہ نہیں بتلا پائیں گے، جب کہ اس کے برخلاف شمسی تقویم، اس کے مہینوں کے نام اور تاریخ ہر کسی کو معلوم ہوتی ہے۔ کسی بھی دن کسی سے بھی پوچھ لیں کہ آج کیا تاریخ ہے تو فوراً بتا دیں گے، جب جب شمسی سال کے پہلے مہینے جنوری کی ابتدا ہوتی ہے تو ”نیو ایئر ناٹ“ پر وہ خوشیاں بھی مناتے ہیں، خوب ہلہ گلہ کرتے ہیں، گویا اس طریقے سے وہ نئے سال کا آغاز کرتے ہیں؛ اس مقام پر ہم نے غور و فکر یہ کرنا ہے کہ ”نیو ایئر“ کی اس طرز پر ابتدا ہم نے کہاں سے لی؟! ہمارے لیے تو ”نیو“ ”نیو ایئر“ کی ابتداء محرم الحرام کے بابرکت مہینہ سے شروع ہوتی ہے، اور چونکہ ہم مسلمان زندگی گزارنے کے طور طریقوں کے معاملے میں مستقل ایک کامل تہذیب کا مالک ہیں اس لیے ہمیں اپنی زندگی کی راہ و رسم میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھکاری پن اختیار کرنا



مسلمان کی مسلمانیت کے خلاف ہی ہمیں کسی کے در پر جھکنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہم تو خود ساری دنیا کو تہذیب و شائستگی کے آداب و طریقے سکھانے والے ہیں۔

نئے مہینے کے استقبال کا اسلامی طریقہ:

تو ”نئے سال“ کی ابتداء ہو یا ”نئے مہینے“ کی، شریعت میں جب بھی یہ (”نئے سال“ یا ”نئے مہینے“ کا) لفظ بولا جائے گا اس سے مراد اسلامی مہینہ ہی ہو گا نہ کہ شمسی مہینہ، چنانچہ اس مہینے کی ابتداء کا مسنون طریقہ شریعت کی طرف سے صرف یہ سامنے آتا ہے کہ مہینے کے اختتام پر نئے مہینے کے چاند کو دیکھنے کا اہتمام کیا جائے، یہ عمل مسنون ہے، اور جب چاند نظر آجائے تو نیا چاند دیکھنے کی دعا بھی پڑھی جائے، یہ بھی مسنون ہے، اس مسنون طریقے کے ہی اپنانے میں اور دعاؤں کا اہتمام کرنے میں برکت، حفاظت اور ثواب ہے، ہمیں فضول قسم کی رسومات اور خرافات سے بچتے ہوئے اسی کا اہتمام کر کے سچے مسلمان اور محب النبی ﷺ ہونے کا ثبوت دینا چاہئے؛ امام ابن السنی نے مہینہ کی ابتداء کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و عادت شریفہ کا یوں ذکر فرمایا ہے: ”إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا رأى الهلال قال: اللهم اجعله هلالاً يميناً وبركة“

(عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی، ص: ۵۹۶، رقم الحدیث: ۶۳۱)

ترجمہ: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی رات کے چاند کو دیکھتے تو یوں دعا مانگتے: اے اللہ! ہمارے لیے اس چاند کو خیر و برکت والا بنادے۔

ہمیں بھی مہینے کی ابتداء اُسی طرح کرنی چاہیے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا؛ تاکہ برکتیں اور رحمتیں حاصل ہوں؛ چہ جائیکہ! ہم رسوم و بدعات اور نوحہ خوانی سے ابتداء کریں۔

اسلامی کیلنڈر استعمال کرنے کی اہمیت:

دوسری بات یہ کہ ہمیں چاہیے ہم اسلامی تقویم ہجری کے استعمال کی عادت ڈالیں، اپنے روز مرہ کے استعمال میں اس تقویم کو سامنے رکھیں، اگرچہ! دوسری تقویات، تاریخوں اور کیلنڈروں کا استعمال گناہ نہیں ہے، شرعاً اس کے اختیار کرنے میں بھی ممانعت نہیں ہے، لیکن شمسی تقویم کا ایسا استعمال کہ ہم اسلامی تقویم کو بالکلیہ بھلا ہی بیٹھیں، یہ کسی طرح درست نہیں، اس لیے کہ اسلامی تقویم ہجری کی حفاظت بھی مسلمانوں کا فرض ہے اور اس کے استعمال میں ثواب ہے، جس سے محروم نہیں ہونا چاہیے، نیز! اپنی شناخت اور اپنے امتیاز کو باقی رکھنا بھی ایک غیرت مند مسلمان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس معاملے میں اس کی بہتر شکل یہ ہے ہم قمری تاریخ کے استعمال کو ترجیحی بنیادوں پر دوسری تقویم کے مقابلے میں استعمال کریں، خدا نخواستہ اگر سب مسلمان اسلامی تقویم ہجری کو چھوڑ بیٹھیں اور بھلا دیں تو سب کے سب اللہ کے مجرم ٹھہریں گے، اس لیے کہ اسلام کی بہت ساری عبادات کا تعلق و ربط اسی تقویم کے ساتھ ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”۔۔۔ البتہ چونکہ احکام شرعیہ کا مدار حساب قمری پر ہے، اس لیے اس کی حفاظت ”فرض علی الکفایہ“ ہے، پس اگر ساری امت دوسری اصطلاح کو اپنا معمول بنالیوے، جس سے حساب قمری ضائع ہو جاوے؛ (تو) سب گنہگار ہوں گے اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی مباح ہے؛ لیکن خلاف سنت سلف ضرور ہے اور حساب قمری کا برتنا بوجہ اُس کے فرض کفایہ ہونے کے لا ابد افضل و احسن ہے“

(بیان القرآن، سورۃ التوبہ: ۳۶، ۳/ ۱۳۱، مکتبہ رحمانیہ، لاہور)



اسلامی سال کے اس پہلے مہینے کی اللہ کے ہاں بڑی قدر ہے، یہ عظمت والے مہینوں میں سے ہے، تاریخی روایات کے مطابق اس مہینے میں بہت سے عظیم الشان واقعات پیش آئے، احکامات کے اعتبار سے صحیح اور مستند احادیث سے جو امور سامنے آتے ہیں وہ صرف دو ہیں :

ماہِ محرم الحرام میں پہلا حکم:

اس ماہِ مبارک میں مطلقاً کسی بھی دن روزہ رکھنا رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ شمار ہوتا ہے، نیز! نو اور دس محرم یا دس اور گیارہ محرم کا روزہ رکھنا اور بھی زیادہ فضیلت کی چیز ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے: افضل الصیام بعد رمضان، شهر الله المحرم، وافضل الصلاة بعد الفريضة صلوة الليل. (صحیح مسلم، کتاب الصوم، باب فضل صوم المحرم، رقم الحدیث: ۲۰۲) ترجمہ: رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل اللہ کے مہینہ محرم کے روزے ہیں، اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل رات کی نماز (تہجد) ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”حين صام رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عاشوراء، وأمر بصيامه، قالوا: يا رسول الله! إنه يوم تَعْظِمُهُ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى؛ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَإِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ، قَالَ: فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ، حَتَّى تُوْفِيَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.»“

(صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب: آیا یوم یصام فی عاشوراء؟) ترجمہ: جب حضرت رسول اللہ ﷺ نے عاشوراء کے دن خود روزہ رکھا، اور حضرات صحابہ کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا؛ تو اس پر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ

علیہم اجمعین نے عرض کیا، کہ اے اللہ کے رسول! اس دن کی تو یہود و نصاریٰ بھی تعظیم کرتے ہیں؟ (غالباً یہ عرض کرنا مقصود ہو گا کہ روزہ رکھ کر تو ہم نے بھی اس دن کی تعظیم کی، گویا ہم ایک عمل میں ان کی مشابہت اختیار کرنے لگے)، تو اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اگر اللہ نے چاہا تو اگلے سال ہم نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھیں گے۔“ (اس طرح سے مشابہت کاشبہ باقی نہیں رہے گا) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: کہ اگلا سال آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔

فقہی مسئلہ:

اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں: صرف عاشوراء کا روزہ نہ رکھا جائے، بلکہ اس کے ساتھ ۹ یا ۱۱ محرم کا روزہ بھی ملا لیا جائے؛ تاکہ یہود کے ساتھ مشابہت سے بچ سکیں، اس نبوی تعلیم سے یہ بات سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں کہ کسی کارِ خیر میں بھی یہود سے مشابہت یا موافقت کو حضرت رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا؛ چہ جائیکہ! دوسری عادات یا معاملات میں ان سے مشابہت کو قبول کر لیا جائے!

صحیح مسلم کی ہی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش بھی زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے: ”عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کانت قریش تصوم عاشوراء فی الجاہلیۃ، وکان رسول اللہ ﷺ یصومه، فلما ہاجر إلی المدینۃ صامہ وأمر بصیامہ، فلما فرض شہر رمضان، قال: من شاء صامہ، ومن شاء ترکہ۔“

(صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم عاشوراء، رقم الحدیث: ۱۱۲۵)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قریش روزہ رکھتے تھے اور جناب رسول اللہ ﷺ بھی روزہ رکھتے تھے، جب آپ علیہ الصلاۃ



والسلام نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، تو وہاں بھی عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، پھر جب ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کی فرضیت کا حکم آیا، تو آپ ﷺ نے لوگوں کو اختیار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”جو چاہے عاشوراء کا روزہ رکھے، جو چاہے نہ رکھے۔“

حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے قبل بھی حضور ﷺ کی اپنی عادت شریفہ روزہ رکھنے کی تھی اور ہجرت کے بعد دوسروں کو بھی تاکید فرمائی تھی۔

ماہ محرم الحرام میں دوسرا حکم:

عاشوراء کے دن اپنے اہل و عیال پر کھانے پینے یا کسی بھی اعتبار سے وسعت کرنا، اس کی خاص فضیلت وارد ہے؛ چنانچہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابوسعید الخدری، حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ وَسَّعَ عَلَى عِيَالِهِ فِي يَوْمِ عَاشُورَاءَ، وَسَّعَ اللَّهُ عَلَيْهِ السَّنَةَ كُلَّهَا۔“

(شعب الإيمان للبيهقي، کتاب الصیام، صوم التاسع والعاشر: ۳/۳۶۵)

ترجمہ: جو شخص عاشوراء کے دن اپنے گھر والوں پر خرچ کرنے میں وسعت، فراخی کرے گا، اللہ تعالیٰ سارا سال اس پر (رزق) میں وسعت فرمائے گا۔

اگرچہ اس حدیث کی اسنادی حیثیت پر کلام ہے؛ مگر محدثین کی تصریحات کے مطابق ایسی روایات جو مختلف طرق سے مروی ہوں، ان کی مختلف اسناد کی وجہ سے ان میں قوت پیدا ہو جاتی ہے؛ اس لیے اس کو فضائل میں بیان کرنے پر کوئی بڑا اشکال باقی نہیں رہتا۔

امام بیہقی رحمہ اللہ اس مضمون کی روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:



”هذه الأسانيد وإن كانت ضعيفة، فهي إذا ضم بعضها إلى بعض،

أخذت قوة. والله اعلم“ (شعب الإيمان للبيهقي، كتاب الصيام، ۳/۳۶۵)

”اگرچہ ان روایات کی سندوں میں ضعف ہے، لیکن ان میں مجموعی طور پر

اتنی بات ضرور پائی جاتی ہے کہ ان اسانید کو ملا لیا جائے تو قوت کی شکل بن جاتی ہے۔“

علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”المقاصد الحسنة“ میں اسی بات کو

اختیار کیا ہے۔ (فی بیان کثیر من الأحادیث المشتهرة على الألسنة، رقم الحديث: ۱۱۹۱، ص: ۴۹۴)

ماہِ محرم سے متعلق دو موضوع احادیث

ایک مخصوص طبقہ فکر کی طرف سے اس ماہِ مبارک میں کچھ موضوع اور من

گھڑت روایات بھی علی الاعلان بیان کی جاتیں ہیں اور ان کا خوب چرچا کیا جاتا ہے،

حالانکہ احادیث نبویہ ﷺ میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ

کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت کرنا جو آپ ﷺ نے بیان نہیں فرمائی، بہت بڑا جرم

ہے، ایسے شخص کے لیے جہنم کی وعید ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من كذب علي متعمداً فليتبوء مقعده من النار۔“

(المقاصد الحسنة فی بیان کثیر من الاحادیث المشتهرة على الألسنة رقم الحديث: ۱۰/۱۳)

ترجمہ: ”جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔“

اس لیے اس ”جرم“ کے ارتکاب سے باز رہنا بہت ضروری ہے، ان من

گھڑت روایات میں سے ایک یہ ہے: ”ما من عبد يبيكي يوم قتل الحسين، إلا كان

يوم القيامة مع أولى العزم من الرسل۔“

(عمل اليوم والليلة لابن السني، ص: ۵۹۶، رقم الحديث: ۶۳۱)

ترجمہ: ”جو شخص بھی شہادت حسین کے دن (ان کے غم میں) روئے گا، قیامت



کے دن وہ اولوالعزم رسولوں کے ساتھ ہو گا۔“

اور ایک دوسری روایت یہ ہے: ”من صام تسعة أيام من أول المحرم

بنی الله له قبة في الهواء ميلا في ميل لها أربعة أبواب.“

(عمل اليوم والليلة لابن السني، ص: ۵۹۶، رقم الحديث: ۶۴۱)

ترجمہ: ”جس نے پہلی محرم سے نو دن کے روزے رکھے، اللہ اس کے لیے ہوا میں ایک خیمہ بنائیں گے، جو ایک میل چوڑا اور ایک میل لمبا ہو گا اور اس کے چار دروازے ہوں گے۔“

واضح رہے کہ ان جیسی بے بنیاد اور جھوٹی روایات کو بیان کرنا یا ان پر یقین کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے اس لیے ان اور ان جیسی بہت سی روایات اور افسانوی باتیں جو محرم الحرام کے آتے ہی عام کی جاتی ہیں کہ جن کی کوئی فنی شہادت اور ثبوت نہیں ہوتا ان سے پورے اہتمام سے نہ صرف بچا جائے بلکہ ان کے بیان کرنے والے کے اس بیان کو رد کرنے کی بھی از حد ضرورت ہے۔

محرم الحرام میں سوگ کرنے کا حکم:

ایک اور چیز جس کا رواج عام طور پر بہت زیادہ ہو چکا ہے کہ یہ مہینہ غم کا مہینہ ہے، اس مہینے میں خوشی نہیں منانی چاہیے، کیوں؟! اس لیے کہ اس مہینے میں نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے چھوٹوں اور بڑوں کو ظالمانہ طور پر نہایت بیدردی سے شہید کر دیا گیا، ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لیے غم منانا، سوگ کرنا اور ہر خوشی والے کام سے گریز کرنا ضروری ہے، سوچنا تو یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں شریعت کی طرف سے کیا راہنمائی ملتی ہے؟؟؟

اس بارے میں سب سے پہلے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا ایک قول ملاحظہ



کرتے ہیں: ”ہر مسلمان کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ غمگین کر دے، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے سردار اور اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، آپ جناب رسول اللہ ﷺ کی سب سے افضل تحتِ جگر کے بیٹے، یعنی: آپ ﷺ کی نواسے تھے، آپ عبادت کرنے والے، بڑے بہادر اور بہت زیادہ سخی تھے، لیکن آپ کی شہادت پر روافض جس انداز سے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں، وہ کسی صورت میں مناسب نہیں ہے، بلکہ ان کی یہ حرکات بناوٹی اور ریاکاری سے تعلق رکھتی ہیں، آپ کے والد (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) آپ سے زیادہ افضل تھے، اُن کو چالیس ہجری، سترہ رمضان، جمعہ کے دن، جب کہ وہ اپنے گھر سے نماز فجر کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، شہید کر دیا، لیکن روافض ان کے قتل کے دن کو اس طرح ماتم نہیں کرتے جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن ماتم کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے افضل ہیں، جنہیں 46 ہجری عید الاضحیٰ کے دن انہی کے گھر میں شہید کر دیا گیا، لیکن روافض ان کے قتل کے دن کو بھی اس طرح ماتم نہیں کرتے، جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن ماتم کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان دونوں حضرات (حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں، جن کو مسجد کے محراب میں نماز کی حالت میں جب کہ وہ قراءت کر رہے تھے، شہید کر دیا گیا، لیکن روافض ان کے قتل کے دن کو اس طرح ماتم نہیں کرتے جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن ماتم کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان تینوں حضرات



سے افضل تھے، لیکن روافض ان کی وفات کے دن اس طرح ماتم نہیں کرتے، جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن ماتم کرتے ہیں۔

اور جناب نبی اکرم ﷺ جو دنیا و آخرت میں بنی آدم کے سردار ہیں، ان کی وفات کے دن بھی یہ روافض اس طرح ماتم نہیں کرتے، جس طرح یہ..... رافضی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن کرتے ہیں۔“

(البدایہ والنہایہ، سنۃ احدى وستین، فی الاخبار بمقتل الحسین بن علی رضی اللہ عنہ)

اس قول کو ملاحظہ کرنے سے ڈھونگ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ”شہادت“ کا مرتبہ خوشی کا ہے یا غم اور سوگ کا؟؟؟!! تعلیمات نبویہ ﷺ سے تو یہ سبق ملتا ہے کہ شہادت کا حصول تو بے انتہاء سعادت کی بات ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا شوق شہادت:

یہی وجہ تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مستقل حصول شہادت کی دعا مانگا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری، کتاب فضائل مدینہ، رقم الحدیث: ۱۸۹۰، ۳/۲۳، دار طوق النجاة)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا شوق شہادت:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنہیں بارگاہ رسالت سے سیف اللہ کا خطاب ملا تھا، وہ ساری زندگی شہادت کے حصول کی تڑپ لیے ہوئے قتال فی سبیل اللہ میں مصروف رہے، لیکن اللہ کی شان انہیں شہادت نہ مل سکی، تو جب ان کی وفات کا وقت آیا تو پھوٹ پھوٹ کے رو پڑے کہ میں آج بستر پر پڑا ہوا اونٹ کے مرنے کی طرح اپنی موت کا منتظر ہوں۔

(البدایہ والنہایہ، سنۃ احدى وعشرين، ذکر من توفی احدى وعشرين: ۷/۱۱۳)



جناب رسول اللہ ﷺ کا شوق شہادت:

شہادت تو ایسی عظیم سعادت اور دولت ہے، جس کی تمنا خود جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے کی اور امت کو بھی اس کی ترغیب دی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، پھر شہید کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور شہید کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور پھر شہید کر دیا جاؤں۔“

(صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، رقم الحدیث: ۴۹۶۷)

الغرض یہاں تو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ شہادت تو ایسی نعمت کا جس کے حصول کی شدت سے تمنا کی جاتی تھی، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر افسوس اور غم منایا جائے، اگر اس عمل تو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں بتلایا جائے کہ پورے سال کا ایسا کون سا دن ہے جس میں کسی نہ کسی صحابی رسول کی شہادت نہ ہوئی ہو، کتب تاریخ اور سیر کو دیکھ لیا جائے، ہر دن میں کسی نہ کسی کی شہادت مل جائے گی، جس کا مقتضی یہ ہے کہ اس دن کو اظہارِ غم اور افسوس بنایا جائے۔

نیز! اس بات کو بھی دیکھا جائے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی تو کئی عظیم اور نبی ﷺ کی محبوب شخصیات کو شہادت ملی، لیکن کیا ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی ان کی شہادت کے دن کو بطور یادگار کے منایا؟؟؟!! نہیں؛ بالکل نہیں، تو پھر کیا ہم اپنے نبی ﷺ سے زیادہ غم محسوس کرنے والے ہیں؟؟؟!!

خدا را ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اس قسم کی شیطانی اور گمراہ کن رسومات و اعماات سے بچانے کی مکمل کوشش کریں۔

شرعاً سوگ کرنے کا حکم:

شرعاً سوگ کرنے کی صرف چند صورتیں ہیں اور وہ بھی عورتوں کے لیے:

- (1) مطلقہ بانہ کے لیے صرف زمانہ عدت میں
- (2) جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے، اس کے لیے صرف زمانہ عدت میں
- (3) کسی قریبی رشتہ دار کی وفات پر صرف تین دن۔

اس کے علاوہ کسی بھی موقع پر عورت کے لیے سوگ کرنا جائز نہیں ہے، اور سوگ کا مطلب یا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس عرصہ میں زیب و زینت اور بناؤ سنگھار نہ کرے، زینت کی کسی بھی صورت کو اختیار نہ کرے، مثلاً: خوشبو لگانا، سرمہ لگانا، مہندی لگانا اور رنگ برنگے خوشنما کپڑے وغیرہ پہننا، اس کے علاوہ کوئی صورت اپنانا مثلاً: انظارِ غم کے لیے سیاہ لباس پہننا یا بلند آواز سے آہ و بکا اور سیاہ لباس وغیرہ پہننا جائز نہیں۔ نیز! مردوں کے لیے تو کسی صورت میں سوگ کی اجازت نہیں ہے تو پھر محرم کے شروع ہوتے ہی سوگ کے نام پر عملی طور پر یرغمال بنالینا کیا معنی رکھتا ہے؟

محرم الحرام میں شادی کرنے کا حکم:

اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق اس ماہِ مبارک میں سوگ کرنا بالکل بے اصل اور دین کے نام پر دین میں زیادتی ہے، جس کا ترک لازم ہے، لہذا جب سوگ جائز نہیں ہے تو پھر شرعاً اس مہینے میں شادی کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ عجیب بات تو یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے شادی اسی ماہِ مبارک میں ہوئی۔

(تاریخ مدینۃ الدمشق لابن عساکر، باب ذکر بنیہ و بناتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام و ازواجہ)

اس مہینے میں شادی نہ ہونے کا مطلب یہ بتاتا ہے کہ اس مہینے میں نحوست ہے



جب کہ شرعاً یہ بات بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے، بلکہ یہ عقیدہ یا ذہن رکھنا ہی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی دن یا زمانے میں کسی قسم کی نحوست نہیں رکھی گئی۔

اکابرین مفتیانِ عظام کے فتاویٰ میں اس کی تصریحات موجود ہیں، ذیل میں فتاویٰ رحیمیہ سے اسی مسئلے کا جواب نقل کیا جاتا ہے :

الجواب: ماہ محرم کو ماتم اور سوگ کا مہینہ قرار دینا جائز نہیں، حدیث میں ہے کہ عورتوں کو ان کے خویش و اقارب کی وفات پر تین دن ماتم اور سوگ کرنے کی اجازت ہے اور اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ منانا ضروری ہے، دوسرا کسی کی وفات پر تین دن سے زائد سوگ منانا جائز نہیں، حرام ہے، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ”لَا يَحِلُّ لِمَرْأَةٍ تَوَمَّنْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تَحْدَّ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا“۔

ترجمہ: ”جو عورت خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھے، اس کے لیے جائز نہیں کہ کسی کی موت پر تین رات سے زیادہ سوگ کرے، مگر شوہر اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔“

(صحیح بخاری، باب: تحد المتوفی عنھا أربعة أشهر وعشراً إلخ)

ماہ مبارک محرم میں شادی وغیرہ کرنا نامبارک اور ناجائز سمجھنا سخت گناہ اور اہل سنت کے عقیدے کے خلاف ہے، اسلام نے جن چیزوں کو حلال اور جائز قرار دیا گیا ہو، اعتقاد ای عمل ان کو ناجائز اور حرام سمجھنے میں ایمان کا خطرہ ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ روافض سے پوری احتیاط برتیں، ان کی رسومات سے علیحدہ رہیں، ان میں شرکت حرام ہے۔ ”ملا بدمنہ“ میں ہے: ”مسلم ترا تشبہ بہ کفار و فساق حرام۔“

یعنی: مسلمانوں کو کفار و فساق کی مشابہت اختیار کرنی حرام ہے۔ (ص: ۱۳۱)

تقلید ائمہ کی اہمیت و ضرورت

بھ..... عبد العلیم اسماعیل ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تقلید کا مفہوم:

قرآن و سنت ایک مسلمان کی زندگی کے لیے رگ جان کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلامی معاشرے کے قائم ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق زندگی گزاری جائے، اس کے لیے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا، اس کی تعلیم حاصل کرنا اور اس کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

ظاہر بات ہے یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں ہے اس کے لیے محنت اور یکسوئی کے ساتھ ساتھ طویل وقت بھی درکار ہے، جس کا ہر کوئی متحمل نہیں ہو سکتا، عام طور پر دنیاوی مشاغل، ضروریات اور کسب معاش کے تقاضے اس راہ میں آڑے آہی جاتے ہیں اور بڑے بڑے حوصلہ مندوں کو بھی آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں، دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ سارے کے سارے مسلمان کلی طور پر علم دین کے حاصل کرنے اور کتاب و سنت میں گہرائی حاصل کرنے کے لیے فارغ ہو جائیں تو دنیا کا سارا نظام ٹھپ پڑ جائے گا اور کاروبار دنیا تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا، اور یہ قدرت کے قانون اور انسان کی پیدائش کے مقصد کے خلاف ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں تفقہ فی الدین کی ترغیب دی ہے، وہاں سارے کے سارے لوگوں کو مخاطب نہیں کیا ہے بلکہ ایک گروہ یا جماعت کو اس پر ابھارا ہے کہ وہ دین میں مہارت حاصل کریں اور اپنے علاقہ والوں کی اصلاح کا کام کریں، چنانچہ ارشاد باری ہے: فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم إذا

رجعوا الیہم [سورة التوبة] یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں علم دین کے لیے کلی طور پر فارغ ہونے والے بہت تھوڑے رہے ہیں اور ان تھوڑوں میں بھی اجتہاد و کمال تک پہنچنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں اس لیے کہ فہم و فراست، عقل و تدبر اور علمی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں رہتی۔ جیسا کہ خود حدیث شریف میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ”لیبلغ الشاهد الغائب فإن الشاهد عسی أن یبلغ من هو أوعى منه۔“ (صحیح بخاری: کتاب العلم)

آپ نے اپنے ان صحابہ کو جو اس وقت موجود تھے یہ ارشاد فرمایا کہ حاضر شخص کو غائب شخص تک (یہ باتیں) پہنچانی چاہیے ممکن ہے کہ وہ (یہ باتیں) اس شخص تک پہنچادے جو اس ”بتلانے والے“ سے زیادہ اس کو سمجھتا ہو، جب اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں براہ راست آپ کی زبان مبارک سے سننے والوں میں فہم کے اعتبار سے حدیث کا مطلب سمجھنے میں اونچ نیچ ہو سکتی ہے تو بعد والوں میں اس کا پایا جانا عین ممکن ہے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ جو کلی طور پر اپنے آپ کو علم دین کے لیے فارغ نہیں کر سکتے یا کتاب و سنت سے براہ راست اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے وہ اپنے پیش آمدہ مسائل میں کیا تدبیر اختیار کریں گے؟ ظاہر بات ہے وہ اپنے علاقہ کے علما اور فقہاء جن کے علم پر ان کو بھروسہ ہے اور جن کی تحقیقات پر ان کو اعتماد ہے ان کی طرف رجوع کریں گے اور مسائل دریافت کریں گے، دور صحابہ سے یہی ہوتا آ رہا ہے اور اسی کا نام تقلید ہے، ظاہر ہے اس کی ضرورت سے کون عقل مند انکار کر سکتا ہے؟

تقلید کی حقیقت:

تقلید کی حقیقت یہی ہے کہ جن مسائل میں دلائل بظاہر متعارض ہوں



(دو حدیثیں الگ الگ مطلب بیان کر رہی ہوں) یا قرآن وحدیث کے الفاظ مشترک معنی میں استعمال کیے جاتے ہوں (ایک لفظ سے ایک سے زائد معنی نکلتے ہوں) اور ایک مفہوم کے متعین کرنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت پڑھتی ہو یا اس طرح کی کوئی دوسری بات ہو جس کی وجہ سے مسئلہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آ رہا ہو اور علماء کے اجتہادات دلائل کی وجہ سے مختلف ہوں دوسرے الفاظ میں مسئلہ بالکل واضح نہ ہو تو ایک عام آدمی یا اس عالم دین کے لیے جو اجتہاد کے درجہ تک نہیں پہنچا ہو کسی مجتہد یا کتاب وسنت کے ماہر کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اس کے بغیر حقیقت تک پہنچنا اور کتاب وسنت پر صحیح طریقہ پر عمل کرنا ناممکن ہوگا، اسی لیے ان مسائل میں تقلید نہیں کی جاتی جو مختلف فیہ نہ ہوں یا جن کے سمجھنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت نہ پڑھتی ہو مثلاً پنجگانہ نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج کی فرضیت اور چوری، زنا اور جھوٹ وغیرہ کی حرمت۔

تقلید کے دلائل:

تقلید کی جس طرح وضاحت کی گئی ہے اس کے اصولی دلائل ہمیں قرآن وحدیث میں کثرت سے ملتے ہیں مختصراً اس کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں۔

دلائل قرآنی:

❖ فاسئلواہل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔

(سورۃ النحل: 34۔ سورۃ الانبیاء: 7)

”اگر تم جانتے نہ ہو تو یاد رکھنے والوں (جاننے والوں) سے دریافت کرو۔“

❖ یاایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول وأولی الامر منکم۔

(سورۃ النساء)

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور جو تم میں سے ذمہ دار ہے اس

کی اطاعت کرو۔“

❖ فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم۔ (سورة التوبة: 221)

”ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تم میں سے ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس لیے نکل پڑے کہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور جب وہ ان کی طرف لوٹیں تو ان کو ڈرائیں۔“

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اپنے پیچیدہ مسائل میں علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

حدیثی دلائل:

❖ جامع ترمذی حدیث میں بروایت حذیفہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ”پتہ نہیں پھر کتنے دن تمہارے ساتھ رہوں اس لیے میرے مرنے کے بعد ابو بکر اور عمر کی اقتدا کرنا“ روایت میں ”اقتدوا“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو عام طور پر دینی امور میں طاعت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

❖ جامع ترمذی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر لکھے گا، دین کے معاملہ میں اپنے سے برتر کو دیکھے اور ان کی اقتداء (تقلید) کرے، دنیوی امور میں اپنے سے کم تر کو دیکھے اور خدا کا شکر ادا کرے“ اس حدیث میں بھی ”فاقتدی بہ“ کا لفظ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اپنے سے پہلے والوں کی دینی امور میں تقلید کی جاسکتی ہے۔



❖ سنن ابوداؤد باب ما ینذ کر فی قرن المائۃ میں ایک حدیث منقول ہے جس کو البانی نے بھی صحیح قرار دیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کی ابتداء میں ایسے شخص کو بھیجے گا جو اس (امت) کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا (دین میں جو کمی بیشی ہوگی اس کی اصلاح کرے گا) ہر صدی میں پیدا ہونے والا مجدد ایک ہو یا ان کی تعداد ایک سے زائد ہوں اس میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس بات سے تو کوئی انکار کر نہیں سکتا کہ جو مجدد نہیں ہوں گے چاہے وہ علماء ہوں یا عوام ان کو تو بحر حال مجددین ہی کی تقلید کرنی پڑے گی۔

اجماع امت :

صحابہ اور بعد کے تابعین، تبع تابعین اور دیگر علماء کا بھی اس پر اجماع ہے کہ عوام اپنے مسائل کئی تحقیق میں اپنے زمانے کے علماء و محققین کی طرف رجوع کرے گی، یہاں تک امام شوکانی جنہوں نے شد و مد سے تقلید کا انکار کیا ہے انہوں نے بھی اجتہاد اور تقلید کے درمیان عوام کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت کا اعتراف کیا ہے اور اس کو ”اتباع“ کا نام دیا ہے۔ (اشارد الفحول للشوکانی: ص 862)

عقلی دلائل :

عقل کا بھی تقاضہ یہی ہے کہ تمام لوگوں کو ایک میزان میں نہ تو لا جائے اس لیے کہ تمام لوگوں کی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ فہم و فراست اور عقل و تدبر کے اعتبار سے بھائی بھائی میں فرق پایا جاتا ہے، جس کے اثرات کا کتاب و سنت کے نصوص کے سمجھنے اور اس کے ذریعہ اجتہاد کرنے کی صلاحیت میں بھی پایا جانا ضروری ہے، دوسری طرف عوام اور کم سمجھنے والوں کو بلا واسطہ کتاب و سنت میں غور کرنے کی

دعوت دینا شریعت کی روح کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ فرمان باری ہے (لایکلف اللہ نفساً الا وسعها) (سورة البقرة)

اللہ کسی کو اس کی صلاحیت سے زیادہ کامکلف نہیں کرتا، دوسری طرف اسی آیت میں ہمیں یہ دعا بھی سکھائی گئی ہے (ربنا ولا تحملنا مالا لا طاقة لنا به) ”اے ہمارے رب ہم پر ہماری طاقت سے زیادہ بوجھ مت ڈالنا“ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کامکلف نہیں بنایا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں انہیں زبردستی مکلف بنانے والے؟؟

تقلید مطلق:

جس میں انسان کسی ایک امام کی تقلید کا پابند نہیں رہتا بلکہ مختلف مسائل میں مختلف علماء کی طرف رجوع کرتا ہے، یہ تقلید ہر زمانہ میں پائی جاتی رہی ہے۔

تقلید شخصی:

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے پیش آمدہ مسائل میں کسی ایک عالم یا فقیہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسی کی تحقیقات پر اعتماد کرتا ہے، اس کے بھی دلائل کتاب و سنت میں پائے جاتے ہیں۔

1: ایک عورت (کسی مسئلہ میں) اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ ﷺ نے دوبارہ پھر حاضری کا حکم دیا، عورت نے دریافت کیا ”اگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ سے رجوع کرنا“ (صحیح بخاری کتاب مناقب الصحابة)

2: مدینہ والوں نے حضرت ابن عباس سے اس عورت کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا جو طواف افاضہ کے بعد حائضہ ہو جائے، انہوں نے جواب دیا کہ طواف وداع کی ضرورت نہیں ہے، اس پر مدینہ والوں نے کہا ”ہم زید بن ثابت کے فتوے کو



چھوڑ کر تمہارے فتوے پر عمل نہیں کر سکتے۔“ (صحیح بخاری: باب إذا حاضت المرأة.. الخ)
 زید بن ثابت کا فتویٰ اس سلسلہ میں مختلف رہا ہو گا، یہاں غور طلب بات یہ
 ہے کہ مدینہ والوں نے ابن عباس جیسے متبحر عالم کے فتوے کو تو چھوڑ دیا لیکن اپنے علاقہ
 کے فقیہ زید بن ثابت کے فتوے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے دوسرے الفاظ وہ زید
 بن ثابت کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے۔

3: اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو جانے سے
 پہلے ان سے دریافت بھی کیا کہ تمہارے سامنے (نئے) مسائل آئیں گے تو تم ان کا حل
 کس طرح کرو گے؟ انہوں نے جو جواب دیا اس سے اللہ کے رسول ﷺ بہت زیادہ
 خوش ہوئے۔ (ابوداؤد: باب اجتہاد الرأی فی القضاء)

معلوم ہوا یمن والے حضرت معاذ کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے، اس لیے کہ
 اختلافی مسائل میں انہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا،
 اسی لیے آپ ﷺ نے ان سے اس طرح کا سوال کیا تھا، یہ تو ان دلائل کی طرف
 مختصر سا اشارہ تھا جن سے تقلید شخصی کی مشروعیت پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

تقلید شخصی کا اطلاق فقہی مکاتب فکر پر بھی ہو سکتا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے جو مکاتب فکر پائے جا رہے ہیں ان میں
 سے کسی ایک کی طرف اپنی نسبت کرنا اور اس کے دائرہ میں اپنے آپ کو محدود کرنا بھی
 تقلید شخصی کے دائرے میں داخل ہو سکتا ہے؟

یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ جن ائمہ اربعہ کی طرف ہم اپنی
 نسبت کرتے ہیں ان کی فقہ پر ہر زمانہ میں لوگوں نے اتنا کچھ کام کیا ہے اور اتنے لوگوں
 کی صلاحیتیں اس کی تنقیح اور تہذیب میں لگ چکی ہیں کہ اب وہ شخصی مسلک نہیں ہے



بلکہ مستقل دبستان فکر کی شکل اختیار کر گئے ہیں، نیز بعد کے ائمہ نے انہیں کے اصول و ضوابط کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے مسائل کو حل کر کے اس میں بے انتہا فروعات اور مسائل کا اضافہ کیا ہے جن کی نسبت بھی دبستان فکر کی طرف کی جاتی ہے جس کے وہ خوشہ چیں رہتے ہیں مثلاً شوافع کے علماء میں مزنی، شیرازی، غزالی، بغوی، اصطخری، رافعی، نووی اور متاخرین میں شربینی، رملی، ہیتمی اور زکریا انصاری وغیرہ، ان کے اجتہادات اور اختیارات کو بھی فقہ شافعی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس لیے اگر کوئی فقہ شافعی کی پیروی کرتا ہے تو اس کو تقلید شخصی کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کو بھی تقلید مطلق کی ایک مخصوص شکل کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا

تقلید شخصی کے اسباب:

متاخرین علماء نے دینی و انتظامی مصلحتوں کے خاطر تقلید شخصی یا مخصوص مکتبہ فکر کی تقلید کو ضروری قرار دیا ہے تفصیل کا تو موقع نہیں ہے مختصر الفاظ میں انکا خلاصہ ”فکری انتشار اور آپسی اختلافات کی کثرت“ کے ذریعہ بیان کیا جاسکتا ہے، کیا اس طرح کی مصلحتوں کی بنا پر جائز حدود کی مزید تحدید کی جاسکتی ہے یا افضل کو چھوڑ کر مفضول پر عمل کیا جاسکتا ہے، دوسرے الفاظ میں تقلید مطلق جس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا اس کو چھوڑ کر دینی و انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر عوام کے لیے تقلید شخصی یا کسی ایک مکتبہ فکر کی طرف نسبت کو ضروری قرار دینے کے لیے شرعی نصوص ہماری رہنمائی کرتے ہیں؟ اس کی طرف بھی مختصر اشارہ کیا جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی مرضی کے مطابق کعبہ کی از سر نو تعمیر کرنا چاہتے تھے جو یقیناً ایک بہتر اور افضل عمل تھا لیکن آپ نے اس خیال یا ارادہ کو اس لیے چھوڑ دیا کہ مکہ والے ابھی تازہ تازہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اس عمل کی وجہ سے کہیں ان



میں انتشار نہ پھیل جائے یا وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ (صحیح مسلم: باب نفقۃ الکعبۃ)
 آپ ﷺ نے قرآن مجید کو ساتھ حروف کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی تھی، حضرت عثمان کے دور خلافت میں جب یہی حروف لوگوں کی کم علمی کی وجہ سے آپسی انتشار و اختلاف کا سبب بن گئے تو حضرت عثمان نے دیگر نسخوں کو جلا کر صرف لغت قریش کے مطابق اس کو لکھنے اور اسی کو سلطنت بھر میں عام کرنے کا حکم دیا۔
 (صحیح بخاری: باب جمع القرآن)

تراویح کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے اللہ کے رسول اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جماعت سے تراویح کا کوئی مستقل نظام نہیں تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ لوگ ایک ہی مسجد میں ادھر ادھر منتشر ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کی نماز میں خلل پڑھ سکتے ہیں تو آپ نے لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کیا حالانکہ خود آپ کو احساس تھا کہ پچھلی رات اٹھ کر انفرادی طور پر جو نماز پڑھتے ہیں وہ ان سے افضل ہیں، لیکن مصلحت کے پیش نظر انہوں نے ایک مفضول چیز کو افضل پر ترجیح دی۔ (صحیح بخاری)

اس وقت صحابہ کثیر تعداد میں موجود تھے پھر بھی حضرت عمر یا حضرت عثمان کے اس عمل پر نکیر نہیں کی گئی اور اس کو ناجائز قرار نہیں دیا گیا، اس لیے کہ خلفاء راشدین کی تقلید کرنے اور ان کے طور طریق کے اختیار کرنے کا خود حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ (سنن ابوداؤد کتاب السنۃ: جامع ترمذی: کتاب العلم)

ائمہ اربعہ کی تخصیص:

ائمہ اربعہ کی تخصیص کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے (جو حقیقت بھی ہے) کہ اگر کسی مسلک پر عمل کرنا ہو تو اس کے لیے ان علماء کا پایا جانا ضروری ہے جن کی تقلید

کی جائے یا ان کی فقہ مدون و منقح شکل میں محفوظ ہوں ظاہر بات ہے یہ دونوں خصوصیتیں ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور امام کے حصہ میں نہیں آسکتی اس لیے ان چاروں ائمہ کو مخصوص کر دیا گیا اس کی بھی اصل ہمیں حدیث میں ملتی ہے مثلاً اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں صحابہ میں بہت سارے قراء اور قرآن کے ماہرین موجود تھے لیکن اللہ کے رسول نے صرف چار صحابہ (ابن مسعود، سالم مولیٰ ابو حذیفہ، ابی ابن کعب اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم) کے سلسلہ میں فرمایا کہ ان سے قرآن مجید کا علم حاصل کیا جائے۔ (صحیح بخاری: باب مناقب معاذ بن جبل)

اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان چاروں کو اس فن میں خصوصی مہارت حاصل تھی جس کی وجہ سے دوسرے صحابہ پر ان کو ترجیح دی گئی۔

دور حاضر میں تقلید شخصی کی ضرورت:

موجودہ زمانہ میں تقلید شخصی کو ضروری نہ قرار دیا جائے تو سہولت پسندی کے متلاشی اپنے نفس کی تسکین کے خاطر جس امام کے یہاں جو مسئلہ آسان نظر آئے گا اس کو اختیار کرنے لگیں گے، اس طرح اتباع شریعت کے نام سے اتباع نفس کا شکار ہو جائیں گے اور دین مذاق اور کھلونا بن کر رہ جائے گا، اور اس کے نتیجہ میں معاشرے میں جو انتشار پہلے گا اس کا وبال دوسرا ہو گا۔

عدم تقلید کے منفی اثرات:

- ❖ اگر مذہب یا تقلید کی قید و بند سے آزاد کیا جائے تو ہر کس و نا کس اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگے گا جس کا نتیجہ سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔
- ❖ لوگ بغیر کسی اصول و قواعد کے اجتہاد کرنے لگیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔



❖ اسلاف کی ہزار سالہ محنتوں پر پانی پھر جائے گا اور اپنے اسلاف کی میراث سے دور ہونے کے نتیجہ میں امت کا ذہنی، فکری، فقہی اور ثقافتی تسلسل ٹوٹ جائے گا اور امت اپنے علما اور اسلاف سے کٹ کر اپنی شناخت کھو بیٹھے گی۔

❖ خود پسندی اور خوداری عام ہو جائے گی جو تمام اختلافات کی جڑ ہے۔

❖ ہر ایک کے اجتہاد کرنے سے اختلافات کو بھی خوب فروغ ملے گا، کیونکہ لوگوں میں دوسروں کو قبول کرنے کی صلاحیت اتنی کم ہے کہ ایک علاقہ میں دو مکاتب فقہ یا فکر کو قبول نہیں کیا جاتا پھر جب ہر آدمی کی فکر اور اس کا اجتہاد الگ ہو گا تو اس کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں؟ اہل نظر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؟

ایک ہی مکتبہ فکر کو رواج کیوں نہ دیا جائے؟

بعض لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ یہ چاروں ائمہ کا اختلاف کیوں؟ کتاب و سنت کی طرف رجوع کر کے کسی ایک ہی طریقہ پر امت کو کیوں نہ لایا جائے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کیا جانا بالکل ناممکن ہے، اگر بالفرض اس طرح کیا بھی جائے تو دیگر بہت ساری سنتیں و اجتہادات متروک ہو جائیں گے جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ چیز بہتر ہوتی تو خود قرآن و حدیث میں ایسے الفاظ و روایتیں کیوں کر پائی جاتی جن سے اختلافات کی گنجائش نکلتی ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ عقل بھی اس کو قبول نہیں کرتی اس لیے کہ ہر جماعت یہی کہے گی کہ ہمارا مسلک ہی برحق ہے اسی کو رواج دیا جائے، آخر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کو اصل قرار دے کر اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا جائے۔

عوام کے لیے تقلید کی حکمتیں:

• کتاب و سنت سے مسائل اخذ کرنا اور ان میں اجتہاد کرنا آسان نہیں ہے، اس کے

لیے عربی زبان، اس کی بلاغت اور اسلوب میں مہارت کے ساتھ ساتھ اصول فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ کا بھی گہرا علم ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ جب اصول ہی سے واقفیت نہ ہو تو کیوں کرا اجتہاد ممکن ہو سکتا ہے؟

• قرآن کا نزول عربی زبان میں تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل کے عرب معاشرے میں ہوا اور ان میں اس وقت جو زبان رائج تھی اس کے اصول و محاورات و تعبیرات اور طریقہ استعمالات کا قرآن مجید میں لحاظ رکھا گیا ہے، آج نہ وہ زبان رہی اور نہ اس کے بولنے والے رہے اور نہ وہ ماحول رہا بلکہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں، محاورات و تعبیرات بدل چکی ہیں جن سے اہل زبان خوب واقف ہیں، اب اگر کوئی متقدمین کی کوششوں سے بے نیاز ہو کر خود سے کتاب و سنت پر غور کرنے لگے تو کیا اس کے منشاء و مقاصد تک پہنچ سکے گا؟ اور اس کے حقیقی مفہوم سے واقف ہو سکے گا؟

• صرف زبان سے واقفیت کی وجہ سے کتاب و سنت کی تہوں تک نہیں پہنچا جاسکتا، اس لیے کہ قرآن مجید عربی زبان میں ان لوگوں کے درمیان نازل ہوا جو عربی زبان کے رمز شناس تھے اور ان کو اپنی زبان دانی پر ایک طرح کا فخر تھا، آج بھی عربی زبان میں سب سے عمدہ کلام اسی دور کا مانا جاتا ہے جس دور میں قرآن مجید نازل ہوا تھا پھر بھی اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کے سمجھنے میں انہیں آزاد نہیں چھوڑا بلکہ اس کے ساتھ اپنا رسول بھی بھیجا تا کہ اس کا صحیح مطلب ان کے سامنے بیان کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ”بیشک اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان کیا جب ان میں انہیں میں سے ایک رسول



بھیجا جو اس کی آیات کی ان پر تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تذکرہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے، غور کرنے کی بات ہے کہ اللہ نے صرف یہ نہیں کہا کہ رسول آیات کی تلاوت کریں گے اور بس! بلکہ یہ بھی کہا کتاب و سنت کی تعلیم بھی دیں گے اگر صرف عربی زبان کو جاننا اور کتاب و سنت کے ظاہری الفاظ ہی کو سمجھنا سب کچھ ہوتا تو پھر ساتھ میں معلم کے بھیجنے اور تعلیم و تدریس کی ذمہ داری اس کے ذمہ سونپنے کی ضرورت کیوں ہوتی؟ دوسری طرف بعض ایسے نصوص بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلیت کے بغیر قرآن مجید میں رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

(جامع ترمذی، سنن ابوداؤد)

- قرآن و حدیث کے دلائل کو جاننا بھی ہر ایک کے بس میں نہیں ہے مثلاً امر کا صیغہ کہاں واجب کے معنی میں ہے اور کہاں غیر واجب کے معنی میں ہے، اور فعل نہی کہاں حرمت کے معنی دے رہا ہے اور کہاں کراہت کے؛ عام احکام یعنی جو صیغے عام ہوتے ہیں ان کو خاص کس طرح اور کب کیا جاتا ہے، اسی طرح نسخ اور منسوخ کے جاننے اور متعارض روایتیں جو بظاہر ایک دوسرے کے خلاف نظر آتے ہیں ان کے درمیان جمع کرنے یا ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینے کا مسئلہ اور اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں جن کی باریکیوں سے ہر شخص واقف نہیں ہو سکتا اور بھی حکمتیں ہیں طوالت کے خوف سے ہم ان سے صرف نظر کر رہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کس و ناکس کو اس طرح کے مسائل میں رائے زنی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اپنے علماء اور اسلاف کی آراء اور ان کے فہم پر اعتماد کرنا چاہیے اور اسی کا نام تقلید ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حقانیتِ کلام اللہ

..... مولانا شفیق الرحمن گلگتی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ نے چار بڑی آسمانی کتابیں اور متعدد صحائف وقت کے نبیوں پر نازل فرمائے اور جس نبی کے دور میں جو بھی آسمانی کتاب اتاری جاتی وہ کتاب اسی وقت کے نبی کے امتیوں کے ساتھ خاص ہوتی اور جب دوسرا نبی آتا تو پہلے والی کتاب کے احکامات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس نئے نبی پر جو کتاب نازل فرمائی جاتی اسی پر عمل پیرا ہونا ضروری تھا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ تورات، زبور اور انجیل کے بعد ایک ایسی کتاب نازل ہوئی جسے کتاب اللہ کا شرف حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ ہونے کا بھی اعجاز حاصل تھا، یعنی قرآن کریم۔

زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ قرآن کریم کے نزول کے وقت سابقہ آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں تھی۔ کتب سماویہ کو طع پرست یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشواؤں نے تحریف کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ ان میں درج احکامات خداوندی کو اپنی خواہشات کے مطابق تبدیل کر دیا لیکن قرآن مجید کے نزول کے وقت ہی اللہ ذوالجلال کی طرف سے حفاظتی حصار ساتھ ہی نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ سابقہ آسمانی کتابیں بھی اگرچہ ہماری طرف سے نازل شدہ تھیں لیکن ہم نے ان کی حفاظت کی از خود ذمہ داری نہیں لی تھی۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے آخری رسول ہیں ان کی نبوت و رسالت نے قیامت کی صبح تک باقی رہنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہونا۔ ضرورت تھی کہ اس پر نازل ہونے والی کتاب بھی قیامت کی صبح تک باقی رہے۔



سابقہ آسمانی کتب وقت وقت کے نبی کے امتیوں کے ساتھ خاص تھیں جبکہ قرآن مجید تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بن کر نازل ہوا ہے یہ ہر زاویے سے کامل، مکمل بلکہ اکمل کتاب ہے۔ شک و ریب سے بالاتر ہے، تحریف و تبدیلی سے منزہ اور پاک ہے۔ کفار و مشرکین کی سازشوں کی بھیٹ نہیں چڑھ سکتی۔ اس کو مٹانے والے خود صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ اس کے بے ادب، گستاخ اور اس کی توہین کرنے والے خدائی قہر کی ہمیشہ لپیٹ میں رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو منکرین کو اپنے ناپاک منصوبوں میں عاجز کر دیتی ہے۔ کفار مکہ نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ آپ ﷺ نے خود بنائی ہوئی ہے پھر اللہ نے خود ہی قرآن کا دفاع کرتے ہوئے ان کفار مکہ کو بتدریج چیلنج پر چیلنج دیے۔ اگر تم کہتے ہو تو تم بھی اس کی مثال پیش کرو۔

دیگر انبیاء کے معجزات وقتی اور عارضی تھے جبکہ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔ جب کفار مکہ نے قرآن کی حقانیت کو مجروح کرنے کیلئے کہا کہ اس کی کوئی حقانیت نہیں یہ اللہ کا کلام ہو ہی نہیں سکتا یہ تو حضور ﷺ نے خود اپنی طرف سے بنائی ہوئی باتیں ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ اگر یہ میرا کلام نہیں کسی بشر کا کلام ہے یا پہلے آباؤ اجداد کے قصے ہیں تو اس جیسا کلام پیش کر کے دکھاؤ۔

تاریخ شاہد ہے کہ خدائی چیلنج کو صدیاں بیت گئیں آج تک کوئی بھی اس جیسا کلام نہیں لاسکا اور قیامت کی صبح تک قرآن کریم جیسا کلام کوئی نہیں لاسکتا۔ اللہ کریم نے سورۃ بنی اسرائیل میں چیلنج کیا ہے: اگر تمام جن وانس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنالائیں تو نہیں لاسکتے۔ اس کے بعد سورۃ توبہ میں اللہ نے اعلان فرمایا تم



مکمل قرآن کریم نہیں لاسکتے تو تم اس جیسی دس سورتیں ہی لاؤ۔ جب وہ اس سے بھی عاجز آگئے تو اللہ نے اعلان کر دیا اگر اس قرآن کے بارے میں ذرا شک بھی ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورۃ بنا لاؤ۔

قرآن کریم کے اعجازی وجوہات تو کافی ہیں ان میں سر فہرست، عدم اختلاف، قوت تاثیر، تعلیم و ہدایت، حفظ و بقاء، قوت دلائل اور فصاحت و بلاغت ہیں۔ الغرض مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیتوں کے لحاظ سے عقلی انسانی کو عاجز کرنے والی مکمل کتاب ہے۔ صحیح مسلم میں ہے: انیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے انہوں نے جب آنحضرت ﷺ کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آئے اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس چلے گئے۔ ان کے بھائی نے پوچھا تم نے کیسا پایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، کاہن ہیں۔ میں نے کاہنوں کا کلام بھی سنا ہے وہ کلام جو محمد سے سنا ایسا نہیں جو کاہنوں کا ہے یہ کاہنوں کی بولی نہیں اور شاعروں کی بولی بھی نہیں ہم نے ایک ایک وزن کو دیکھ لیا مگر وہ کلام الہی ہی ہے۔

مسند ابی یعلیٰ اور سیرت ابن اسحاق میں حدیث منقول ہے: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ابو جہل اور قریش کے دیگر سردار جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ محمد جو کلام سناتے ہیں اس کی حقیقت کو جاننے کیلئے کسی ایسے آدمی کی تلاش کریں جو شعر جانتا ہو۔ قریش کے سردار عتبہ بن ربیعہ نے کہا میں جا دو کہانت سب کچھ جانتا ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں خود جا کر دیکھوں۔ چنانچہ آستانہ نبوی ﷺ میں آکر صلح کی کچھ شرائط پیش کیں آنحضرت ﷺ نے اس کے جواب میں سورہ فصلت پڑھنی شروع کی کچھ ہی



آیتیں پڑھی تھیں کہ اس نے آپ ﷺ کے منہ مبارک پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ قرابت کا واسطہ بس کرو۔ واپس آئے اور تین دن تک گھر سے باہر نہ آئے۔ ابو جہل نے جا کر کہا کہ اے عتبہ! محمد کے ہاں کھانا کھا کر پھسل گئے ہو۔ عتبہ نے کہا تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں مجھ کو دولت کی طمع دامن گیر نہیں ہو سکتی لیکن محمد ﷺ نے میرے جواب میں ایسا کلام پیش کیا وہاں نہ شعر تھا نہ کہانت تھی، نہ جادو تھا میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا انہوں نے جو کلام پڑھا اس میں عذاب الہی کی دھمکی تھی ڈر کی وجہ سے قرابت کا واسطہ دے کر چپ کر آیا۔

اسی طرح جب نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جب سورہ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر کہا: اللہ کی قسم! یہ کلام اور انجیل ایک ہی چراغ کے پر تو ہیں۔

(مسند احمد ج 1 ص 202، مستدرک حاکم ج 2 ص 310)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل ایک سورۃ کی چند آیتیں سن کر موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے اور آپ ﷺ سے سورۃ طور کی چند آیات سن کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

(صحیح بخاری تحت تفسیر سورہ طور)

حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن کی چند آیات پہنچیں تو مسلمان ہو گئے۔

(مسند احمد ج 1 ص 318)

قرآن کی حقانیت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ تقریباً ساڑھے چودہ سو برس گزر گئے کہ کوہ صفاء کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل چیلنج کیا کہ وہ اس کا جواب پیش کریں مگر صدیاں بیت گئیں اس کا جواب نہیں ملا۔

اسلام پر امن مذہب ہے!!

پوری دنیا میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جو بلا امتیاز انسانیت کی امن و سلامتی اور حقوق کا ضامن ہے۔ یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو برابر عدل و انصاف فراہم کرتا ہے۔ اسلام کی زیر سایہ مملکت میں جس طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو محفوظ ہوتی ہے اور وہ سکون کی زندگی بسر کرتا ہے بالکل اسی طرح غیر مسلم کو بھی اس کا مکمل استحقاق ہوتا ہے۔ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم و جبر نہیں کر سکتا۔ اسلامی حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ جو غیر مسلم زیر معاہدہ ان کی حکومت کے تحت رہتے ہیں ان کی جان و مال، عزت و آبرو پر کوئی فرق نہ آنے دے۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے سوا چودہ سو سال پہلے اخوت و بھائی چارگی کا درس دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کونوا عباد اللہ اخواناً۔ اللہ کی بندگی اختیار کرو اور آپس میں رواداری، اخوت و محبت سے رہو۔ اسلام کبھی بھی بغض و عناد، حسد و کینہ پروری کی اجازت نہیں دیتا خواہ اس کا تعلق باہمی رہن سہن کے کسی بھی درجے کا ہو۔ گھر ہو، برادری ہو، محلہ ہو، بستی ہو، شہر ہو، ملک ہو یا بین الاقوامی تعلقات ہوں۔ کسی بھی مملکت کے سلطان و وزیر، حکام اور رعایا ہوں یا پوری انسانی برادری کی بات ہو۔ شرق و غرب کے باشندے ہوں یا جنوب و شمال کے گوشوں میں زندگی بسر کرنے والے۔ بہر حال! اسلام کی آفاقی سطح پر تعلیم یہی ہے کہ ساری انسانیت کو عدل و انصاف مہیا کیا جائے۔ اسلام کو باقی ادیان کے مقابلے میں سب سے زیادہ انصاف پسند مذہب ہونے کی وجہ سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ ساری انسانیت کے



امن و انصاف کی بات کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں یہ بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر شعبہ زندگی کو پرسکون ماحول میسر کیا جائے کسی انسان کی حریت فکر و مجروح نہ ہو، قتل و غارت گری کو بالکل ختم کیا جائے، فتنہ و فساد اور خوف و ہراس سے بچایا جائے۔

سارے عالم کے ہر فرد بشر میں امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا جذبہ اجاگر کرتا ہے۔ جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو اسلام انسان کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ جبر و اکراہ سے اسے قبول کریں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام خود کو ابدی نجات کا ضامن ٹھہراتا ہے اور قوت دلائل سے اس پر آمادہ بھی کرتا ہے، دیگر ادیان کے منسوخ اور ناقابل عمل ہونے کو بھی واضح کرتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود علی الاعلان یہی کہتا ہے: لا اکراہ فی الدین دین حق کو قبول کرنے اور اس میں داخل ہونے میں کوئی جبر نہیں۔ اسلام اپنی آفاقیت اور قابل عمل ہونے کی خدائی برہان بھی اپنے پاس سند کے طور پر رکھتا ہے: ان الدین عند اللہ الاسلام اللہ کے ہاں قابل عمل، ابدی و دائمی نجات کا واحد ضامن اگر کوئی دین ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ جبکہ دیگر مذاہب کے بارے میں زمینی حقائق بتلاتے ہیں کہ ان میں جبر و تشدد پایا جاتا ہے۔

فرید و جدی لکھتے ہیں: اسلام سے پہلے مذاہب میں انسانیت کو مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنے میں بے رحمی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جو لوگ انکار کرتے وہ بھڑکتی آگ میں ڈال دیے جاتے، پھاڑنے والے حیوانات کے آگے ڈالے جاتے تھے۔ یہ ان کی دونوں ٹانگیں دو گھوڑوں کے پاؤں میں باندھ کر ان کو مختلف سمتوں میں چھوڑ دیتے تھے۔ تانبا پگھلا کر ان پر ڈالتے تھے یا ان کو مدھم آگ پر کئی کئی روز تک لٹکائے رکھتے تھے۔ ان کی شور و فریاد اور آہ و فغاں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ان کا گوشت کٹ کٹ کر گرگرتا جاتا اور چربی پگھل کر بہتی جاتی۔ (المذہب والاسلام ص 143)

تذکرۃ المحدثین:

کھ..... مفتی شبیر احمد حقانی رحمۃ اللہ علیہ

امام سلیمان بن مہران الاعمش رحمۃ اللہ علیہ (3)

تنبیہ:

مذکورہ واقعہ سے جہاں امام اعمش اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کا باہمی تعلق معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بے شک فن حدیث میں امام اعمش کے شاگرد ہیں لیکن فن فقہ میں اپنے استاذ گرامی سے فائق نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعمش نے مسائل کو آپ کی طرف متوجہ فرمایا۔ عصر حاضر میں بعض الناس نے (جن کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے نامعلوم کیا عداوت ہے کہ ان کی شانِ تفقہ اور مقبولیت عامہ کو دیکھ کر جل بھن جاتے ہیں اور جہاں سے آپ کی عظمت کا کوئی پہلو نکل رہا ہو اسے محو کرنا اور اس میں کیڑے نکالنا اپنا فرض منصبی سمجھنے لگتے ہیں) مذکورہ مکالمہ سے احناف (کثر اللہ سوادہم) پر یہ بات تھونپنے کی کوشش کی ہے کہ:

1: احناف اس واقعہ سے امام اعمش کا مرتبہ گراتے ہیں اور انہیں صرف ایک محدث مانتے ہیں اور فقیہ نہیں مانتے۔

2: امام اعمش نے سوال مذکور کا جواب دینے کی جو فرمائش امام صاحب سے کی وہ ان کی صلاحیت کا امتحان لینے کی غرض سے تھی نہ اس لئے کہ آپ غیر فقیہ تھے۔

3: شاگرد استاد سے زیادہ بڑا عالم کیسے ہو سکتا ہے؟

4: اس واقعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ امام اعمش سے مسائل پوچھنے کے لئے آتے تھے۔ اگر آپ غیر فقیہ ہوتے تو لوگوں کا کسی غیر فقیہ سے فقہی مسائل

پوچھنے کے لئے آنا کیا معنی رکھتا ہے؟

عرض ہے کہ:

1: احناف امام اعمش کا مرتبہ بالکل نہیں گراتے بلکہ ان کی شانِ محدثانہ کے نہ صرف قائل بلکہ ان کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔

(دیکھیے الجواہر المصیdie فی طبقات الحنفیة للقرشی: ص 617 وغیرہ)

باقی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ آپ کا اصل میدان فنِ حدیث تھا اور آپ وقت کے مایہ ناز محدث تھے۔ فقہ سے آپ کا شغف تھوڑا بہت رہا تو ہے لیکن شانِ فقہ، مجتہدانہ صلاحیت، دقائِقِ فقہ سے شناسائی اور استنباطِ مسائل کا جو ملکہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا وہ آپ کو حاصل نہ تھا۔ یہ بات واضح رہے کہ ایک شخص ایک فن کا امام ہو اور دوسرے فن میں اسے ایسا درجہ حاصل نہ ہو تو یہ چیز اس کے مرتبہ کے گرنے کی دلیل ہر گز نہیں۔ نامعلوم بعض الناس کو کیا سوچھی کہ اسے قدر و منزلت کے گرنے کی بنیاد ٹھہرانے پر مصر ہیں۔

2: رہی یہ بات کہ سائل کے سوالات کے جوابات خود دینے کے بجائے امام ابو حنیفہ سے کیوں دلوائے اس کی وجہ خود اس واقعہ میں موجود ہے، آپ فرماتے ہیں:

نَحْنُ الصِّيَادِلَةُ وَأَنْتُمْ الْأَطِبَاءُ. کہ ہم پنساری ہیں اور تم اطباء ہو۔

مطلب یہ کہ فقہ کے میدان میں آپ کی حیثیت طبیب اور ہماری پنساری سی ہے۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ پر شانِ فقہات کا غلبہ ہے اور مجھ پر شانِ تحدیث کا اثر نمایاں ہے۔ تو امام ابو حنیفہ کے فقہی تفوق کا اقرار جب اس واقعہ میں خود موجود ہے تو کسی کے کچھ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے!؟

3: ایسا ممکن ہے کہ شاگرد کسی فن میں استاذ سے فائق تر ہو بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض مرتبہ شاگرد اسی فن میں استاذ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے کئی شیوخ حدیث ہیں لیکن جو جلالتِ شان فن حدیث میں امام بخاری کو حاصل ہے وہ آپ کے کئی اساتذہ حدیث کو بھی حاصل نہ ہوگی، نیز آپ کی کتاب صحیح البخاری کو جو شہرت ملی ہے وہ خاص آپ ہی کا حصہ ہے۔ مزید یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ شاگرد کا فائق ہونا اور فن کی بلندی کو چھونا یہ استاذ ہی کی شان و شوکت شمار ہوتا ہے۔ نامعلوم بعض الناس اسے استاذ کی کم مرتبی کس طرح گردانتے ہیں۔ لیجیے ہم دو واقعات پیش کرتے ہیں جن سے خوب واضح ہو گا کہ امام اعمش کے ہاں امام ابو حنیفہ کا کیا مرتبہ ہے؟!

واقعہ نمبر 1: محمد بن عبید الطنافسی کہتے ہیں کہ امام اعمش ایک بار حج کے ارادے سے نکلے، جب مقام ”حیرہ“ پر پہنچے تو علی بن مسہر سے فرمایا: اذهب إلی ابی حنیفۃ حتی یکتب لنا المناسک۔ ابو حنیفہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ہمیں مناسک حج لکھ کر دیں۔

(الانقضاء لابن عبد البر: ص 195 - واسنادہ صحیح)

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ اس واقعہ کے تحت رقمطراز ہیں:

ومع هذا قد اخذ عنه۔ (ص 195 حاشیہ)

استاذ ہونے کے باوجود امام اعمش نے امام ابو حنیفہ سے عملی استفادہ کیا ہے۔

واقعہ نمبر 2: عبد اللہ بن نمیر کا بیان ہے کہ ایک بار امام اعمش سے کسی نے کوئی

مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: انما یحسن الجواب فی هذا ومثله النعمان بن ثابت

الحزاز اراہ بورک لہ فی علمہ۔ (الانقضاء: ص 196 - واسنادہ جید)



ان جیسے مسائل کا بہترین جواب نعمان بن ثابت خزار جیسے آدمی ہی دے سکتے ہیں، میرا خیال یہی ہے کہ اس کے علم میں برکت ڈالی گئی ہے۔

4: محدث جب مجلس حدیث منعقد کرتا ہے تو اس میں مسائل کا آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس پر اعتراض کا مدار رکھا جائے۔ چونکہ شیخ اور استاذ حدیث وسط مجلس میں ہوتے تھے اور پوری جماعت میں نمایاں ہوتے تھے تو آنے والے مسائل لا محالہ اسی کی طرف ہی رخ کرتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بعض الناس کے اعتراض کا وزن بالکل ہلکا پڑ جاتا ہے۔

ظرافت طبعی:

امام اعمش کو جہاں علم و عمل کی دولت عطا ہوئی تھی وہاں ظرافت طبع کا بھی خاص حصہ ملا تھا۔ آپ بلاشبہ اپنے زمانے کے سید المحدثین تھے لیکن اس کے باوجود تکلف و تصنع سے کوسوں دور رہتے تھے خصوصاً اپنے تلامذہ کے ساتھ انتہائی بے تکلف اور دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ ظرافت طبعی کے واقعات آپ کی زندگی کا حصہ رہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے چند ایک پیش خدمت ہیں۔

1: آپ کے شاگرد ابو بکر بن عیاش کا بیان ہے کہ اگر ہم کسی سے حدیث سن کر امام اعمش کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ پوچھتے: کہاں سے آئے ہو؟ ہم اس کا نام لیتے تو فرماتے: ”طل مخرق“ کہ وہ تو پھڑپھڑا ہوا ڈول ہے، کبھی فرماتے: ”طیر طیار“ وہ تو اڑنے والا پرندہ ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ج 5 ص 451)

اس طرح کے مزاحیہ جملوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنائے رکھتے۔ ان جملوں سے کسی کی تحقیر و تضحیک مقصود نہ ہوتی بلکہ شخص مذکور کے ایک خاص وصف یا خصلت کی طرف اشارہ کرنا مقصد ہوتا۔



2: آپ کے شاگردوں کا بیان ہے: ایک دفعہ ہم طلبہ نے باہمی مشورہ کیا کہ آج استاذ ہمیں کھانے کے لیے جو چیز بھی عنایت فرمائیں اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے، پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے حسبِ عادت گوشت سے ہماری خاطر مدارت کی۔ ہم سارا گوشت کھا گئے۔ پھر آپ گھر سے ایک بڑے برتن میں ٹرید لے آئے، ہم نے اسے بھی کھالیا۔ پھر چھوٹے سے مشکیزہ میں دودھ لے آئے ہم اسے بھی ختم کر گئے۔ پھر فرمانے لگے: اللہ تعالیٰ ہی تمہارا فیصلہ کرے! (یعنی تمہارا پیٹ خدا ہی بھرے) تم نے آج ایک بوڑھے (یعنی اعمش) اور اس کی بوڑھی (یعنی اعمش کی بیوی) کو رات کی روٹی تک سے محروم کر دیا۔ پھر اعمش گھر گئے، چارہ لائے اور یہ مزاحیہ جملہ بولا: فہذا قوت شاتی فکلوہ۔

یہ بکری کا چارہ ہی رہ گیا ہے، اب اسے بھی کھالو۔

(سیر اعلام النبلاء: ج 5 ص 446 و 451)

3: امام اعمش کی اپنے گھر والوں سے کچھ تلخ کلامی ہو گئی جس کے نتیجے میں اعمش ناراض ہو گئے، کچھ دوستوں نے گھر والوں سے ان کی صلح کروانا چاہی۔ چنانچہ وہ ان کے گھر گئے، اعمش کی بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

اے ام محمد! اللہ تجھ پر رحم کرے، تمہیں ابو محمد کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا چاہیے جو سن رسیدہ محدث ہیں اور: لا یزھدک فیہ عمش عینہ، ودقۃ ساقیہ، وضعف رکبتیہ، و تن بطنہ، و یخرمہ، و جمود کفہ!

ان کی کمزور نظر، پتلی پنڈلیوں، ضعیف و ناتواں گھٹنوں، بدبودار ناک، تلخ لہجہ اور خشک ہتھیلیوں (یعنی فقر کی حالت) پر پریشان نہیں ہونا چاہیے (بلکہ صبر کرنا چاہیے اور دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے)



اعمش نے جب یہ گفتگو سنی تو کہا: قم قبحك الله، فقد أريتها من عيوبی ما لم تكن تعرفه، خدا تجھے عارت کرے! تم نے ان سے میری ان خامیوں کا بھی ذکر کر دیا جو ابھی تک اس کی نظر سے پوشیدہ تھیں۔

(الفقهاء والاعراب: ص 75)

4: امام اعمش کے بارے میں جریر کہتے ہیں کہ ہم ایک دن اعمش سے ملنے کے لیے چلے تو ان کو ایک خلیج کے کنارے بیٹھے دیکھا جو بارش کے پانی سے پیدا ہوئی تھی، ہم اس کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئے کہ ایک سیاہ فام شخص آیا، جب اس نے امام اعمش کے خستہ و بوسیدہ لباس کو دیکھا تو ان کو حقیر سمجھ کر ان سے بگالینے کے لیے کہا: اے غلام اٹھ! مجھے اس خلیج سے پار کر دے اور ان کا ہاتھ کھینچ کر کھڑا کر لیا اور ان پر سوار ہو گیا اور یہ کلمات یعنی سواری کی دعا پڑھنے لگا (جو سواری پر سوار ہونے کے وقت مسنون ہیں) سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ۔

اعمش اس کو لادے ہوئے چل دیے، یہاں تک کہ جب خلیج کے بچے میں پہنچ گئے تو اسے زمین پر دے مارا اور کہنے لگے: اب پڑھ! رَبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبَارَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ۔ (یہ دعا منزل مقصود پر پہنچ کر پڑھی جاتی ہے) پھر اسے اس گندے کیچڑ میں ہاتھ پاؤں مارتا چھوڑ کر چلے آئے۔ (سیر اعلام النبلاء: ج 5 ص 447)

عبادت و ریاضت:

امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ (ت 198ھ) جب بھی امام اعمش کا ذکر کرتے تو فرماتے: كان من النساء، وكان محافظا على الصلاة في الجماعة، وعلى الصلوة الأولى۔ (حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 58، و تاریخ بغداد: ج 7 ص 119)

کہ امام اعمش عباد گزاروں اور زاہد لوگوں میں سے تھے۔ آپ ہمیشہ جماعت

کے ساتھ صف اول میں نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

امام و کعب بن الجراح رحمہ اللہ (ت 197ھ) فرماتے ہیں:

كان الأعمش قريبا من سبعين سنة لم تفتته التكبيرة الأولى.

(حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 57)

کہ امام اعمش کی عمر ستر سال کے قریب تھی، اس عمر میں بھی آپ کی تکبیر اولیٰ تک فوت نہیں ہوئی۔

امام عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی رحمہ اللہ (ت 211ھ) فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب نے ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ امام اعمش رات کو نیند سے اٹھ کر قضائے حاجت کے لئے گئے تو آپ کو پانی میسر نہ ہوا۔ آپ نے اپنے ہاتھ دیوار پر مارے اور تیمم کیا پھر جا کر سو گئے۔ آپ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

أخاف أن أموت على غير وضوء. (حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 57)

کہ مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں بغیر وضوء کی حالت میں مجھے موت نہ آجائے۔

امام ابو نعیم الاصبہانی رحمہ اللہ (ت 430ھ) فرماتے ہیں:

سليمان الأعمش... الإمام المقرء، الراوى المفتي، كان كثير العبل، قصير الأمل، من ربه راهبا ناسكا، ومع عبادة لا عبا ضاحكا. (حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 54)

کہ سلیمان الاعمش بہت بڑے امام، قاری، راوی اور مفتی تھے۔ آپ بہت زیادہ عبادت کرتے اور بہت کم خواہشات کے مالک تھے، عابد اور زاہد بن کر رہتے اور اپنی عبادات کے باوجود آپ ہنسی مذاق بھی کیا کرتے تھے۔

وفات حسرت آیات:

علم و عمل کا یہ آفتاب 148 ہجری کو فہ میں غروب ہو گیا۔ امام ذہبی فرماتے



ہیں: مات الأعمش فی ربيع الأول. سنة ثمان وأربعين ومائة. بالكوفة.

(سیر اعلام النبلاء: ج 5 ص 450)

جس دن آپ کی وفات ہوئی اس دن عبد اللہ بن داؤد الخریبی نے کہا:
اعمش کو جس دن فوت ہونا تھا فوت ہو گئے لیکن اپنے بعد خود سے زیادہ
عبادت گزار کسی کو نہ چھوڑا۔ (تاریخ بغداد: ج 7 ص 119)

اقوال زریں:

1: منصور بن ابو الاسود کہتے ہیں کہ میں نے امام اعمش سے اللہ تعالیٰ کے اس

فرمان: ﴿وَكَذَلِكَ نُؤَيِّ بِعُضِّ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [الأنعام: 129]

کا مطلب پوچھا کہ اس میں مفسرین کی کیا رائے ہے، تو آپ نے فرمایا: يقولون: إذا
فسد الناس أمر عليهم شرارهم. جب لوگ بگڑ جائیں تو ان پر حکمران بھی شریر
قسم کے مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 59)

2: حمید بن عبد الرحمن کہتے ہیں کہ میں نے امام اعمش کو یہ کہتے ہوئے سنا:
موتیوں کو خنزیروں کے پاؤں تلے مت روندو۔ (حلیۃ الاولیاء: ج 5 ص 60)

3: عثمان بن علی روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام اعمش کو کہتے سنا: ”جب تم کسی
عالم کو دیکھو کہ وہ قرآن کریم نہیں پڑھتا اور حدیث نہیں لکھتا تو اس سے دور رہو وہ شیخ
القمر ہے۔“ ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر (راوی) سے پوچھا: شیخ القمر کون
ہے؟ آپ نے فرمایا: ”شیخ القمر ان دہریہ لوگوں کو کہتے ہیں جو چاندنی رات میں جمع ہو
کر تاریخی واقعات میں بڑی دون کی لیتے ہیں اور مسائل دینیہ میں ان کی جہالت کا یہ
حال ہوتا ہے کہ اچھی طرح وضوء کرنا بھی نہیں جانتے۔“

(شرف اصحاب الحدیث للخطیب: 1/67، والمحدث الفاضل: ص 306)

قسط نمبر 4:

بھ..... الشیخ محمد نواز الحدادی رحمہ اللہ

عربی خطبہ جمعہ مقامی زبان میں... علمی و تحقیقی تجزیہ

خیر القرون سے خطبہ جمعہ کے ذکر ہونے کا ثبوت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین کرام رحمہم اللہ کے بہترین دور میں بھی خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ پر ذکر اللہ کا اطلاق ہوتا تھا، اس سلسلے میں کچھ تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

1: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ جمعہ کے وقت دیر سے پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دیر سے آنے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ اور نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دیر سے آنے کا عذر پیش فرمایا۔ اس روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں: حتی یفرغ من الذکر۔ یعنی جب خطبہ اور نماز سے فارغ ہوئے پوری روایت یوں ہے:

عبد الرزاق عن بن جریج قال أخبرني عمرو بن دينار أن عكرمة مولى بن عباس أخبره أن عثمان جاء وعمر يخطب يوم الجمعة فأنشأ عمر ناحية الرجل يجلس حتى يفرغ من الذكر فقال عثمان يا أمير المؤمنين ما هو إلا أن سمعت الأولى فتوضأت وخرجت فقال عمر لقد علمت ما هو بالوضوء۔

(مصنف عبد الرزاق باب الغسل يوم الجمعة ج 3 ص 195، 196)

اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ خطبہ کی حقیقت ذکر ہے۔

2: حضرت عطاء تابعی رحمہ اللہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ میں نے خطبہ جمعہ کا بہت تھوڑا سا حصہ پایا امام اس وقت خطبہ کے آخر میں ناپ تول میں کمی سے منع کر رہا تھا، اور پورا تولنے کا حکم دے رہا تھا کیا میں ظہر کی چار رکعت پڑھوں یا جمعہ کی دو رکعت تو انہوں نے فرمایا: قد امر الله بذلك فذلك من الذکر فاقصر۔

اللہ تعالیٰ نے اس خطبہ کا جو حکم دیا اس کی حیثیت ذکر کی ہے لہذا تو دو رکعت پڑھ لے۔ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں: عبد الرزاق عن بن جریج قال قال إنسان لعطاء لم أدرك الخطبة الا وهو في المكيال والميزان قال قد امر الله بذلك فذلك من الذکر فاقصر۔

(مصنف عبد الرزاق باب من فاته الخطبة ج 3 ص 238)

اس روایت سے تو خطبہ کی حیثیت بالکل واضح ہو گئی کہ اس کی حقیقت ذکر اللہ ہے وعظ و نصیحت محض اس کے تابع اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

3: خطبہ جمعہ کے دوران اگر ضرورت کی وجہ سے امام کوئی ضروری بات کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن از خود مقتدیوں کے لیے خطبہ جمعہ کے دوران آپس میں گفتگو کرنا جائز نہیں ہے، امام عبد الرزاق رحمہ اللہ نے اپنی المصنف میں اس پر مستقل یہ باب قائم کیا ہے: باب يكلمه الامام على المنبر يوم الجمعة في غير الذکر۔

اس عبارت سے جس طرح یہ ثابت ہے کہ امام منبر پر خطبہ جمعہ کے دوران بوقت ضرورت بقدر ضرورت بات کر سکتا ہے اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ خطبہ جمعہ کی حقیقت ذکر اللہ ہے نہ کہ وعظ و نصیحت۔ اس لیے کہ ضرورت کی بات کے علاوہ امام منبر پر جو خطبہ دے گا اس پر ذکر کا اطلاق ہوا ہے۔

(مصنف عبد الرزاق ج 3 ص 215)



باب مذکور تحت امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے یہ روایت بھی ذکر فرمائی ہے:
حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عطاء رحمہ اللہ سے
پوچھا کہ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خطبہ جمعہ میں ذکر اللہ کے سو کسی اور چیز کے خلط
کرنے سے بچتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں۔

روایت ملاحظہ ہو: عبدالرزاق عن بن جریر قال قلت لعطاء أكانوا
يتوقون أن يخلطوا الخطبة بشيء إلا بذكر الله تعالى قال نعم قلت أكانوا
يتشهدون في الخطب يوم الجمعة قال نعم قلت فلما سمينا الحامدين قال
نقول الحمد لله رب العالمين قلت والاستسقاء أو الاستشفاء قال لا بأس
(مصنف عبدالرزاق ج 3 ص 216)

ثابت ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی خطبہ جمعہ کو ذکر اللہ سمجھتے تھے۔
4: حضرت عطاء رحمہ اللہ سے ہی جمعہ کے خطبہ کے دوران لوگوں کے امام سے
کلام کے درست نہ ہونے کی وضاحت پر مشتمل ایک اور روایت ہے اس میں بھی خطبہ
جمعہ کے لیے ذکر کا اطلاق ہوا ہے۔

پوری روایت ملاحظہ فرمائیں: عبدالرزاق عن بن جریر قال قلت
لعطاء كلام الناس الامير وهو يخطب يخصه بمديث أو يسأله عن شيء من
الذكر قال أكره ذلك قال قلت فكلام الناس الامام وهو على المنبر
يثنون عليه قال وأكرهه إنما الجمعة ذكر۔ (مصنف عبدالرزاق ج 3 ص 216، 217)
اس روایت میں إنما الجمعة ذكر (جمعہ کے خطبہ اور نماز کی حیثیت صرف
ذکر ہے) کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خطبہ جمعہ کی حیثیت ذکر اللہ کی ہے نہ کہ وعظ و
نصیحت کی۔



5: امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنی المصنف میں یہ باب نقل کیا ہے: باب استقبال الناس۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ امام جب خطبہ جمعہ کے لیے مسجد میں آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے، اس سلسلے میں مروی ایک روایت میں بھی خطبہ جمعہ کے لیے ذکر کے الفاظ ہیں۔

پوری روایت کے الفاظ یہ ہیں: عبد الرزاق عن بن جريج قال قلت لعطاء استقبال الناس الامام يوم الجمعة والقاص بمكة وغيرها يدعون البيت قال نعم ثم أخبرني حينئذ عمن أخبره عن يعلى بن أمية أنه جاء عبید بن عمیر يقص ها هنا وأشار إلى ناحية بني مخزوم وسان بن يعلى أو سعيد بن يعلى مستقبل البيت فدعا يعلى فقال ما حملك على ما صنعت استقبال الذکر فقال حينئذ عباد بن أبي عباد هو سنان بن يعلى۔

(مصنف عبدالرزاق ج 3 ص 217)

اس روایت میں استقبال الذکر کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خطبہ جمعہ کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ مذکورہ تمام روایات سے ثابت ہوا کہ خطبہ جمعہ کی حقیقت خیر القرون میں بھی ذکر اللہ ہی سمجھی جاتی تھی۔ الحمد للہ

مقامی زبان میں ترجمہ ناجائز ہونے کی وجوہات

پہلی وجہ: اصلی حالت پر نہ رہنا:

جب قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور خیر القرون کی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ خطبہ جمعہ کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ ذکر اللہ میں اصل الفاظ وہ ہیں جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ہیں اور وہ عربی زبان میں

ہیں اس لیے ضروری ہے کہ خطبہ جمعہ عربی زبان میں دیا جائے۔

دوسری وجہ: اجماع کے خلاف ہے:

یہ چیز نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مواظبت اور اجماع کے خلاف ہے۔ عربی خطبہ جمعہ پر نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے بیشکی فرمائی ہے، باوجود اس کے کہ ان کے مخاطب عجمی بھی تھے، اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عمل اور مواظبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی باوجودیکہ جس طرح آج تبلیغ احکام اور ان کی تعلیم و اشاعت کی حاجت ہے اس وقت اس سے زیادہ تھی، کیونکہ اب تو کتب و رسائل ہر قوم کی زبان میں ہزار رہا موجود ہیں اور اس وقت سلسلہ تصنیف بالکل نہ تھا، نیز یہ بھی نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ہمیشہ اہل عرب ہی ہوں بلکہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ روم و فارس اور مختلف بلاد عجم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس خطبہ میں شریک ہوتے تھے، اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ مادری زبان عربی ہونے کے دوسری زبان میں خطبہ نہ دیتے تھے، تو اگر مقصود خطبہ و وعظ و تبلیغ یہی تھا اور تبلیغ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم عرب و عجم کے لیے عام ہے تو عجمیوں کی رعایت سے ایسا کیا جاسکتا ہے کہ کسی صحابی کو حکم فرمادیتے تو خطبہ کے بعد ہی اس کا ترجمہ عجم کی زبان میں سنادیتے جیسا کہ بعض وفود وغیرہ سے مکالمہ کے وقت ترجمان سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن تمام عمر نبوی میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مروی نہیں، آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک سیل رواں کی صورت



میں بلادِ عجم میں داخل ہوئے اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں اسلام کا کلمہ نہیں پہنچا دیا اور شعائرِ اسلام نماز اور جمعہ اعیاد قائم نہیں کر دیے، ان حضرات کے خطبے تاریخ کی کتابوں میں آج بھی بالفاظِ مذکور و مدون ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی بلادِ عجم میں داخل ہونے کے بعد اپنے مخاطبین کی ملکی زبان میں خطبہ نہیں دیا، حالانکہ وہ ابتداءً فتح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، جب کہ تمام لوگ تبلیغِ احکام کے لیے آج سے کہیں زیادہ محتاج تھے، یہاں یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو عجمی زبان سے واقفیت نہ تھی کیونکہ بہت سے صحابہ کرام کے متعلق ان کی سوانح و تذکروں میں تصریح ہے کہ وہ فارسی یا رومی یا حبشی وغیرہ زبانیں جانتے اور ان میں بخوبی تقریر کرتے تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق ثابت ہے کہ وہ بہت سی مختلف زبانیں جانتے تھے اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تو خود فارس کے رہنے والے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشہ کے اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ روم کے باشندے تھے اسی طرح بہت سے حضرات صحابہ ہیں جن کی مادری زبانیں عربی کے علاوہ دوسری تھیں۔

اس کے علاوہ اگر معافی خطبہ کو عجمیوں کے علم میں لانا بوقتِ خطبہ ہی ضروری سمجھا جاتا اور خطبہ کا مقصد صرف تبلیغ ہی ہوتی تو جو سوال آج کیا جاتا ہے کہ خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ اردو یا دوسری ملکی زبانوں میں کر دیا جائے، یہ کیا اس وقت ممکن نہ تھا؟ جیسا کہ دوسری ملکی اور سیاسی ضرورتوں کے لیے ہر صوبہ میں عمالِ حکومت اپنے پاس ترجمان رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک مستقل ترجمان انہیں ضرورتوں کے لیے اپنے پاس ملازم رکھا ہوا تھا۔

(رواہ البخاری فی الوفود)

لیکن اس کے باوجود بھی نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ آپ نے عربی خطبہ کا ترجمہ ترجمان کے ذریعہ ملکی زبان میں کرایا ہو اور نہ کسی دوسرے صحابی سے، اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ خطبہ کے لیے سنت یہی ہے کہ صرف عربی زبان میں پڑھا جاوے اور بوقت خطبہ کوئی ترجمہ وغیرہ اس کا نہ کیا جائے۔
(جواہر الفقہ ص 353، 354 ناشر مکتبہ دارالعلوم کراچی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ خطبہ جمعہ کے عربی ہونے پر امت کا تعامل کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: چوں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وخلفاء را ملاحظہ کر دیم تنقیح آں وجود چند چیز است حمد و شہادتین و صلوة بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و امر بتقوی و تلاوت و قرآن پاک و دعائے مسلمین و مسلمات و عربی بودن خطبہ و عربی بودن نیز بجهت عمل مستمرہ مسلمین در مشارق و مغارب باوجود آں کہ در بسیاری از اقالیم مخاطبان عجمی بودند۔

(مصنفی شرح موطا امام مالک ج 1 ص 253 باب التشدید علی من ترک الجمعة بغیر عذر)
ترجمہ: جب ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں پر نظر ڈالی تو ان میں چند چیزوں کا ثبوت ملا جن میں حمد و ثنا اور کلمہ شہادت اور درود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تقویٰ کا حکم دینا اور کسی آیت کا پڑھنا اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرنا اور خطبہ کا عربی زبان میں ہونا، اور خاص عربی زبان میں خطبہ کا ہونا اس لیے ہے کہ تمام مسلمانوں کا مشرق و مغرب میں ہمیشہ یہی عمل رہا ہے باوجودیکہ بہت سے ممالک میں مخاطب لوگ عجمی تھے۔

لہذا غیر عربی میں خطبہ جمعہ یا اس کا ترجمہ عجمی زبان میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے خلاف ہے، اور اس کی



مخالفت جائز نہیں، چنانچہ غیر مقلد عالم صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی دین اسلام سے خروج ہے، جس پر یہاں جہنم کی وعید بیان فرمائی گئی ہے، مومنین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو دین اسلام کے اولین پیرو اور اس کی تعلیمات کا کامل نمونہ تھے اور ان آیات کے نزول کے وقت جن کے سوا کوئی گروہ مومنین موجود نہ تھا، کہ وہ مراد ہو، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور غیر سبیل المومنین کا اتباع دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز کا نام ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے اور منہاج سے انحراف بھی کفر و ضلال ہی ہے، بعض علماء نے سبیل المومنین سے مراد اجماع امت لیا ہے یعنی اجماع امت سے انحراف بھی کفر ہے، اجماع امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علماء و فقہاء کا اتفاق یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق، یہ دونوں صورتیں اجماع کی ہیں اور دونوں کا انکار یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے، تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے لیکن اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع و اتفاق کے دعوے تو بہت سے مسائل میں کیے گئے لیکن فی الحقیقت ایسے اجماعی مسائل بہت ہی کم ہیں جن میں فی الواقع امت کے تمام علماء و فقہاء کا اتفاق ہو، تاہم ایسے جو مسائل بھی ہیں ان کا انکار بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے انکار کی طرح کفر ہے، اس لیے صحیح حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

(صحیح ترمذی للالبانی رقم 1759، احسن البیان ص 125 ص 256، الحدیث شمارہ 61)

لہذا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخالفت کی وجہ سے درست نہیں۔

تیسری وجہ: خلاف سنت ہے:

جس کام کو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باوجود کر سکنے کے نہ کیا ہو اس کا ترک سنت ہے اور اس کی مخالفت خلاف سنت ہے:

یہ وجہ اگرچہ دوسری وجہ سے ملتی جلتی ہے تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو الگ ذکر ذکر کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ جس کام کو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باوجود کر سکنے کے نہ کیا ہو حالانکہ اس دور میں اس کی ضرورت بھی تھی تو اس کو نہ کرنا اور چھوڑنا سنت ہے، نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مخاطب حضرات میں بھی غیر عربی لوگ تھے، لیکن ان حضرات نے پھر بھی خطبہ جمعہ کو غیر عربی میں یا اس کے ترجمہ غیر عربی میں نہ کیا اور نہ کروایا، جب انہوں نے اس کام کو نہ کیا تو اس کا نہ کرنا اور اس کو چھوڑنا سنت ہے اور اس کی مخالفت خلاف سنت اور بدعت ہے، اس اصول کو کئی حضرات نے ذکر فرمایا ہے، چند ایک کی عبارات پیش خدمت ہیں:

1: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کل عبادۃ لم یتعبدھا اصحاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا۔ (الاغتصام ج 1 ص 113)

ہر وہ عبادت جس کو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ کیا ہو سو تم بھی اس کو مت کرو۔

2: امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به

اولھا فما لم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا۔ (الشفاء للقاظمی ج 2 ص 88)



اس امت کے بعد والے لوگوں کی ہرگز اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اس چیز سے کہ جس سے اس امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی، چنانچہ جو چیز اس وقت دین نہ تھی وہ آج بھی دین نہ ہوگی۔

3: حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جس طرح پیروی کسی کام کے کرنے میں ہوتی ہے اسی طرح چھوڑنے میں بھی ہوتی ہے لہذا جس نے کسی ایسے کام میں ہمیشگی کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔

(مرقاۃ شرح مشکاۃ ج 1 ص 41)

4: علامہ قسطلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کام کو نہ کرنا یعنی چھوڑنا ہمارے حق میں سنت ہے۔
(شرح قسطلانی ج 7 ص 335)

5: علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جو قول و فعل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ ہو اسے اہل السنۃ والجماعت بدعت کہتے ہیں کیونکہ اگر وہ بھلائی کا کام ہوتا تو وہ ہم سے پہلے ضرور کر گزرتے کیونکہ وہ حضرات رضی اللہ عنہم بھلائی کی کسی بھی خصلت کی طرف پیش قدمی کیے بغیر نہیں رہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج 4 ص 156)

6: ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ترک کے ثبوت کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہوتا تو یقیناً نقل کیا جاتا جب کسی نے نقل نہیں کیا اور نہ ہی کسی مجمع میں بیان کیا گیا، تو معلوم ہو گیا کہ وہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔

(اعلام الموقنین ج 1 ص 304)

مذکورہ تمام عبارات سے معلوم ہوا کہ جس کام کو باوجود کر سکنے کے نہ کیا گیا تو وہ کام نہ کیا جائے گا، اور اس کا نہ کرنا سنت ہو گا اور اس کی مخالفت خلاف سنت اور



بدعت ہوگی، اور غیر عربی میں خطبہ جمعہ یا عربی کے ساتھ اس کا غیر عربی میں ترجمہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ کیا گیا حالانکہ جو ضرورت آج بیان کی جاتی ہے اس دور میں اس سے بڑھ کر موجود تھی، لہذا یہ عمل خلاف سنت اور بدعت ہوگا۔

اس پر ایک مثال اور ذکر کرنا مناسب ہوگی، وہ یہ کہ حضرت عمارہ بن روہیہ رضی اللہ عنہ نے بشر بن مروان کو منبر پر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو سخت لہجے میں ارشاد فرمایا: قبح اللہ ہاتھین الیہدین لقد رايت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یزید علی ان یقول ہکذا بیدہ و اشار بأصبعہ المسبحۃ۔

(صحیح مسلم ج 1 ص 287)

اللہ تعالیٰ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا ناس کرے میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارہ کی انگلی سے زیادہ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ غور فرمائیں! حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں کے نہ اٹھانے کو بطور دلیل پیش فرمایا یہ اس بات پر واضح دلیل ہے کہ جس کام کو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود کر سکنے کے نہ کیا ہو تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔

چوتھی وجہ: مختصر کو طویل کرنا ہے:

ترجمہ کی صورت میں خطبہ جمعہ لمبا ہو جائے گا، حالانکہ اس کا مختصر ہونا ضروری نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ خطبہ جمعہ مختصر ہو اگر عربی کے ساتھ اس کا غیر عربی میں ترجمہ بھی کیا گیا تو لامحالہ خطبہ جمعہ لمبا ہو جائے گا جو کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی ہے۔

(.....جاری ہے)

لوحِ ایام

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا میں معزز مہمانان گرامی کی آمد اور متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ کے اندرون و بیرون ممالک کے مختلف مسکنی اسفار اہم مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات سے خصوصی ملاقاتیں

19 اگست 2015ء کو تین ماہ کی نظر بندی کے بعد متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ رہا ہو کر مرکز اہل السنۃ والجماعۃ تشریف لائے۔ جہاں ان کا بھرپور استقبال کیا گیا۔ بعد ازاں رہائی کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ملک بھر سے علماء کرام، سیاسی و سماجی شخصیات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کا تانتا بندھ گیا۔ مذہبی جماعتوں کے قائدین و فود کے ہمراہ مبارکباد دینے کے لیے تشریف لائے۔

3 ستمبر 2015ء بروز جمعرات صبح 9:00 بجے تا شام 5:00 بجے عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ کے صوبائی و ضلعی ذمہ داران کا اجلاس ہوا۔

3 ستمبر 2015ء بروز جمعرات بعد نماز مغرب ماہانہ اصلاحی مجلس کا انعقاد ہوا، جس میں مکہ مکرمہ سے فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالحفیظ مکی مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے اور معروف ثناء خوان ترجمان جمعیت حافظ زین العابدین جلالی نے خصوصی شرکت کی۔

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن کی خصوصی دعوت پر ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد کے مہتمم مولانا فیض الرحمن عثمانی تشریف لائے اور تخصص فی التحقیق والدعوۃ کے طلباء کو علم العروض والقوافی کا چار روزہ دورہ کرایا۔

[ماہنامہ فقہ کے مستقل ممبر بننے دوستوں کے نام ماہنامہ فقہ سبسکریپشن کیجیے]

ممبر شپ کا طریقہ

نام:..... ولدیت.....

رابطہ نمبر:..... ای میل:.....

بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر نمبر (لازمی):.....

بینک کا نام:..... رقم جمع کرانے کی تاریخ:.....

مکمل ایڈریس: ☐:.....

مکان / فلیٹ / دکان / دفتر نمبر، ڈاکخانہ، تحصیل، ضلع اور صوبہ واضح لکھیں:

نوٹ: فارم کسی بھی سادہ کاغذ پر فل آپ کر کے سرکولیشن مینیجر ماہنامہ فقہ کے نام

درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یا بینک ڈرافٹ نمبر اور مکمل پتہ فون پر لکھوادیں۔

پتہ: دفتر رسائل و جرائد (ماہنامہ فقہ) مرکز اہل السنۃ والجماعۃ 87 جنوبی سرگودھا۔

نوٹ: رقم کی ادائیگی بذریعہ منی آرڈر درج بالا پتے پر کریں۔

بذریعہ بینک ڈرافٹ: میزبان بینک سرگودھا بنام محمد الیاس 14010100725862

نوٹ: اپنا مکمل نام و پتہ، بینک ڈرافٹ نمبر لازمی ہمیں ارسال کریں اور بذریعہ فون

یا S.M.S یا ای میل ☐ ہمیں اس کی اطلاع دیں۔

وائس ایپ:

Whatsapp پر ہمارا رابطہ نمبر یہ ہے: +923062251253

mag@ahnafmedia.com

فون ☎: 03326311808

ماہنامہ فقہ ملنے کے پتے

ایجنسی ہولڈرز	علاقہ	فون نمبرز
دارالایمان	کراچی	03342028787
ڈاکٹر تحسین اللہ	پشاور	03339217613
مولانا محمد نوید حنیف	آزاد کشمیر	03132317090
مولانا محمد شہباز	کبیر والا	03066310082
مولانا محمد صدیق	ڈیرہ غازی خان	03356351893
مولانا محمد عثمان	میانوالی	03336836228
مولانا عمر خطاب	اٹک	03077375075
رحمت اللہ	کوہاٹ	03449251287
مولانا خالد زبیر	فیصل آباد	03153759031
مولانا خالد زبیر	چکوال	03335912502
محمد رئیس	ٹانک	03319143483
مولانا محمد دلاور	اداکاڑہ	03136969193
مولانا عبد اللہ قمر	قصور	03008091899
مولانا عبد اللہ شہزاد	حافظ آباد	03212374824
عبد الوکیل عزیزی	سیالکوٹ	03338639255
ذوالقرنین حیدر	ڈیرہ اسماعیل خان	03343682508

نوٹ: ایجنسی بک کروانے کے لیے رابطہ کریں: 03326311808